بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

حلف نامہ

میرا تحقیقی مقالہ ''شہزاد نیّر کی طویل نظموں کا فکری و اسلوبیاتی جائزہ'' میری ذاتی کاوش اور ان تھک محنت و ریاضت کا ثمر ہے۔ ادب کے میدان میں شہزاد نیّر کی طویل نظموں پر پہلی دفعہ میں نے خامہ فرمائی کی ہے۔ امید ہے یہ کاوش آئندہ تجزیہ نگاروں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

عائشہ کرن

رولنمبر: ۰۲۵۳۰۲

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ عائشہ کرن رولنمبر ۰۲۵۳۰۲ نے اپنا تحقیقی مقالہ برائے بی ایس بعنوان ''شہزاد نیّر کی طویل نظموں کا فکری و اسلوبیاتی جائزہ'' نہایت محنت سے میری زیرِ نگرانی مکمل کیا ہے۔ عاشہ کرن نے تسوید کے تمام مراحل خوش اسلوبی سے طے کیے ہیں۔ میں اس مقالے کی پیش کش سے مطمئن ہوں اور مقالے کو ڈگری کے حصول کی کاروائی کے لیے یونیورسٹی میں پیش کرنے کی سفارش کرتی ہوں۔

نگران

صفیہ کوثر

فہرست ابواب

پیش لفظ ۵۔۶

باب اوّل: ۷۔۱۸

شہزاد نیّر۔سوانح وشخصیت

(الف) سوانح

(ب) شخصیت

(ج) تصانیف

باب دوم: ۱۹۔۲۳

شہزاد نیّر کی نظم ''خاک'' کا فکری واسلوبیاتی جائزہ

باب سوم: ۲۳۔۴۵

شہزاد نیّر کی نظم ''نوحہ گر'' کا فکری واسلوبیاتی جائزہ

باب چہارم: ۴۶۔۹۸

شہزاد نیّر کی شاعری پر ایک نظر

محاکمہ ۱۰۱

کتابیات ۱۰۳

دیباچہ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔اسی کا کرم ہے کہ آج میرا بی ایس کا مقالہ تکمیل کو پہنچا۔اللہ تعالیٰ کے بعد میں جس ہستی کا شکر ادا کرنا چاہوں گی وہ میری والدہ ہیں۔جنھوں نے مجھے حوصلہ دیا۔پڑھایا لکھایا۔مجھے قابل بنایا۔ہر طرح کے حالات میں میرا خیال رکھا۔یہ انھی کی قربانیوں،محنت اور دعاؤں کا صلہ ہے۔

ماں باپ کے بعد استاد ہماری زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ہمیں شعور عطا کرتے ہیں اور فہم و فراست سے نوازتے ہیں۔ماں باپ کے بعد اساتذہ کی ہی دعائیں ہمارے ساتھ ہوتی ہیں۔مجھے زندگی میں کئی اساتذہ سے کسبِ فیض کا موقع ملا اور میں نے سب سے کچھ نہ کچھ سیکھا۔کسی سے میں نے قلم کو پکڑنا سیکھا اور کسی سے قلم کو چلانا۔کچھ اساتذہ ایسے ملے جو میری تحریر میں نکھار کا سبب بنے۔ایسی ہی ایک شخصیت میرے مقالے کی نگران کی ہے جنھوں نے مقالے کا موضوع منتخب کرنے میں میری خصوصی رہنمائی کی۔

مقالہ لکھنے میں سب سے اہم مرحلہ موضوع کا انتخاب ہے۔اس کٹھن مرحلے کو میری نگران نے میرے لیے آسان کیا اور موضوع کے حوالے سے میری رہنمائی کی۔اپنے قیمتی وقت سے مجھے وقت دیا۔میرے لکھے ایک ایک لفظ کو پرکھا اور درست سمت میں رہنمائی کی۔دوسری اہم شخصیت جس نے مقالے کی تکمیل میں مدد کی وہ شہزاد نیّر صاحب کی ہے۔شہزاد نیّر صاحب نے مجھے اپنے متعلق بہت سی معلومات فراہم کیں۔ہر طرح کا مواد مجھے فراہم کیا۔میں شہزاد نیّر صاحب کی خصوصی شکر گزار رہوں۔

مقالے کا عنوان ''شہزاد نیّر کی نظموں ''خاک'' اور ''نوحہ گر'' کا فکری و اسلوبیاتی جائزہ'' ہے۔مقالے کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔تقسیم یہ ہے:

باب اوّل:شہزاد نیّر۔سوانح و شخصیت

اس باب کو بھی تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

(الف) سوانح:اس حصے میں شہزاد نیّر کے سوانحی حالات مذکور ہیں۔

(ب) تصانیف: اس حصے میں شہزاد نیّر کی تصانیف کا بیان کیا گیا ہے۔

(ج) شخصیت: اس حصے میں شہزاد نیّر کی شخصیت کو بیان کیا گیا۔ یہ بیان ان کے احباب، بیوی اور اولاد کے حوالے سے ہے اور کچھ باتیں خود شہزاد نیّر کی بتائی ہوئی ہیں۔

باب دوُم: شہزاد نیّر کی نظم ''خاک'' کا فکری و اسلوبیاتی جائزہ

اس باب میں شہزاد نیّر کی نظم ''خاک'' کو پرکھا گیا ہے جو ان کی تصنیف ''برفاب'' سے ماخوذ ہے۔

باب سِوُم: شہزاد نیّر کی نظم ''نوحہ گر'' فکری و اسلوبیاتی جائزہ

اس باب میں شہزاد نیّر کی طویل نظم ''نوحہ گر'' کا فکری و اسلوبیاتی جائزہ لیا گیا ہے جو ان کی تصنیف ''گرہ کھلنے تک'' سے ماخوذ ہے۔

باب چہارم: شہزاد نیّر کی شاعری پر ایک نظر

اس باب میں ان کی نظموں کا فکری و فنی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چار ابواب کے بعد محاکمہ یعنی مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور آخر میں کتابیات درج ہے۔

مقالے کی ابتدا سے انتہا تک مجھے اپنی نگران کا تعاون حاصل رہا۔ انھوں نے ہمیشہ میری لغزشوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے میرا حوصلہ بڑھایا۔ یہ ان کی لگن اور توجہ کا نتیجہ ہے کہ میرا مقالہ انجام کو پہنچا۔ اللہ میری مس کو اسی طرح قائم دائم اور سلامت رکھے اور وہ مُجھ جیسی کم فہم طالبات کو یوں ہی چراغ کی طرح روشنی عطا کریں۔ آمین۔ اپنے سب گھر والوں کی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے مقالے کے دوران ہر طرح سے میری معاونت کی۔ میرے نوٹس فوٹو سٹیٹ کروائے۔ مجھے کتب مہیا کیں۔ مجھے لائبریری لے جانے کی ذمہ داری اُٹھائی اور مجھے گھر میں پڑھنے کا پورا ماحول فراہم کیا۔ دُعا ہے کہ میری محنت اس کے پرکھنے والے کے معیار پر پوری اُترے۔ آمین۔

مقالہ نگار:

عائشہ کرن

باب اوّل: شہزاد نیّر۔ سوانح و شخصیت

(الف) سوانح

(ب) تصانیف

(ج) شخصیت

باب اوّل

شہزاد نیّر۔سوانح وشخصیت

(الف) سوانح

کسی بھی ادیب یا شاعر کو بہتر طریقے سے جاننے کے لیے اس کی شخصیت، ماحول، خاندانی پس منظر، تعلیم وغیرہ کو جاننا بہت ضروری ہوتا ہے۔شاعر کی شخصیت، اس کی زندگی میں آنے والے نشیب وفراز اور زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے آشنائی حاصل کر کے ہی اس کی تحریر اور فن پارے کی قدر و قیمت متعین کی جاسکتی ہے۔کیوں کہ لکھنے والا عموماً زندگی کے واقعات اور مشاہدات کا نچوڑ ہی قلم میں ڈبو کر لکھتا ہے۔ایک ادیب کسی بھی معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔وہ اپنے آس پاس ہونے والے واقعات سے لازمی اثر لیتا ہے اور کسی طور انھیں نظر انداز نہیں کرسکتا۔جبھی صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے اور یہ تحریریں ہی انسان کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ان تحریروں سے بھی ہم شخصیتوں کو جانچ لیتے ہیں۔یہ ادبی سرمایہ، لکھنے والے کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔

خاندانی پس منظر:

شہزاد نیّر کے آباؤ اجداد عرصہ دراز سے گوجرانوالہ کے نواحی گاؤں گوندلانوالہ میں پیدا ہوئے۔وہ کھیتوں میں کام کر کے روزی کماتے۔شہزاد نیّر کے والد کا نام محمد رفیق تھا۔وہ ایک صنعتی مزدور تھے۔والدہ کا نام صغریٰ بی بی تھا۔شہزاد نیّر کا اصل نام محمد شہزاد ہے۔ان کی پیدائش ۴۔اپریل ،۱۹۷۳ء کو اپنے گاؤں میں ہوئی۔ شہزاد نیّر کے چھے بہن بھائی تھے۔گھر میں شروع سے ہی غربت کا دور دورہ تھا۔تمام بہن بھائیوں نے بڑی محرومی میں بچپن بسر کیا۔گھر میں فریج اور ٹی۔وی جیسی اشیا بھی ناپید تھیں۔(۱)

تعلیم :

شہزاد نیّر نے ابتدائی تعلیم گوجرانوالہ کے نواحی گاؤں گوندانوالہ سے حاصل کی ۔ روایتی تعلیم میں عربی اور فارسی لازمی نصاب کا حصہ تھے اور شہزاد نیّر کو شروع ہی سے ایسے اساتذہ ملے جو پڑھائی کے معاملے میں سخت گیر تھے ۔ لہٰذا شہزاد نیّر شروع سے ہی تعلیم کی طرف متوجہ رہے اور عربی پر خاصا زور دیا۔ گورنمنٹ ہائی سکول گوندانوالہ سے ۱۹۸۹ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور کچھ کر دکھانے کی لگن انھیں لاہور کے ایف ۔ سی کالج میں لے آئی ۔ ایف ۔ سی کالج میں داخلہ لے کر انھیں دیہاتی اور شہری زندگی کے تضاد کا ادراک ہوا۔ کالج میں اکثریت امیر طلبا کی تھی ۔ دیہی ماحول اس کالج کے مقابلے میں بے حد سادہ تھا۔ شہزاد نیّر ان دنوں اسی بات پر غور و فکر کرتے رہتے ۔ اپنے احساسِ محرومی کو دور کرنے کے لیے اور کالج کے رنگ میں رنگنے کے لیے انھوں نے پینٹ شرٹ پہننی شروع کر دی ۔ ایف ۔ سی کالج میں انھیں بہترین اساتذہ سے کسبِ فیض کا موقع ملا۔ ان اساتذہ میں احمد عقیل روبی، کمال الدّین اور رضی حیدر شامل تھے جو اس وقت ایف ۔ سی کالج کی پہچان ہوا کرتے تھے ۔ ان اساتذہ نے شہزاد نیّر پر گہرا اثر چھوڑا ۔ اپنی حساس طبیعت کے باعث شہزاد نیّر کا رجحان مطالعے کی طرف بڑھ گیا۔ شہری زندگی کی چکا چوند میں گُم ہونے کی بجائے انھوں نے مطالعے میں غرق ہونا مناسب سمجھا اور کالج کے طلبا سے دوستی کرنے کی بجائے کتابوں سے دوستی کر لی ۔ ایف ۔ سی کالج کی لائبریری میں نادر ذخیرہ موجود تھا ۔ یہیں سے انھیں فلسفے میں دلچسپی پیدا ہوگئی لیکن کالج کے ماحول سے ذہنی مطابقت نہ ہوسکی اور انھوں نے دوسرے سال ہی اپنا تبادلہ گوجرانوالہ کالج میں کروا لیا۔ وہاں انھوں نے پری میڈیکل میں داخل لیا لیکن ۱۹۹۱ء میں ایف ۔ ایس ۔ سی میں اچھے نمبر نہ لینے پر میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ہوسکا۔ بعد ازاں انھوں نے گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں بی ایس سی کے لیے اپلائی کیا اور ساتھ ہی آرمی کمیشن کے لیے بھی درخواست دائر کر دی ۔ فوج میں سلیکشن کے باعث انھوں نے بی ایس سی ترک کر دی اور ۱۹۹۳ء میں پاک فوج میں شامل ہوگئے ۔ یوں انھوں نے اپنی گریجوایشن ۱۹۹۵ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی میں ٹریننگ کے

دوران مکمل کی۔ ۲۰۰۵ء میں ایم۔اے اردو بلوچستان یونیورسٹی سے کیا۔ ۲۰۱۲ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ماس کمیونیکیشن میں ایم۔اے کیا۔ ۲۰۱۴ء میں فارسی زبان میں ڈپلومہ کیا۔ بعدازاں ۲۰۱۸ء میں انھوں نے ماس کمیونیکیشن میں ایم فل کیا۔

ملازمت:

شہزاد نیّر نے مئی، ۱۹۹۳ء میں فوج میں شمولیت اختیار کیا ور کاکول میں دو سال ٹریننگ کی۔ ٹریننگ کرنے کے بعد ان کی پوسٹنگ کوہاٹ کے شمالی علاقہ جات میں ہوئی۔ یہاں انھیں فطرت کے قریب رہنے کا موقع ملا اور کافی تجربہ حاصل ہوا۔ سیاچن کے مقام پر وہ فطرت کی سفّاکی سے آگاہ ہوئے۔ اس دور میں شہزاد نیّر فطرت اور کتب کے قریب ہوتے چلے گئے۔ انھوں نے بے حد مطالعہ کیا اور فطرت کا مشاہدہ کیا۔ یہاں انھیں کائنات کی وسعت کا ادراک ہوا اور یہ کہ فطرت انسان پر رحم نہیں کرتی۔ انسان اور فطرت کے مابین گہرا تضاد ہے جس سے انسان صدیوں سے لڑتا چلا آ رہا ہے۔ ماہنامہ سرخ چنار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''میدانی علاقوں کے باسیوں کے لیے برف حسن ہے جب کہ سیاچن میں برف سفّاکی کی علامت ہے اور انسان کی قاتل ہے۔''(۳)

یہیں پر انھیں انسان کے بدلتے رویوں کا بھی شعور حاصل ہوا کہ کیسے انسان حالات کے مطابق خیالات اور نظریات بدل لیتا ہے۔ انسانی دورخی سے آشنائی انھیں اسی ٹریننگ کے دوران ہوئی۔ ٹریننگ کی تکمیل کے بعد اپریل، ۱۹۹۵ء میں سیکنڈ لیفٹیننٹ بن گئے۔ ۱۹۹۹ء میں کیپٹن اور ۲۰۰۷ء میں میجر بن گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آج کل شہزاد نیّر بطور لیکچرار مختلف اداروں میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔(۴)

شادی اور اولاد:

شہزاد نیّر نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی ان کے ماموں کی بیٹی ریحانہ کوثر سے ۱۹۹۶ء میں ہوئی۔ وہ ایک سیدھی سادی گھریلو خاتون تھیں جو ایک ادیب، شاعر، فلاسفر کو اس طرح نہ سمجھ سکیں جس طرح پڑھی لکھی

عورت سمجھتی ہے۔ چنانچہ ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب دونوں میں علیحدگی ہوگئی اور بعد ازاں سرطان کے باعث ۲۰۱۴ء میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔شہزادنیّر نے اپنی ہم مزاج خاتون سیما فردوس سے ۲۰۰۴ء میں شادی کی۔ سیما فردوس ایک پڑھی لکھی باشعور اور سلیقہ مند خاتون ہیں۔انھیں شعروشاعری پڑھنے کا شوق ہے اور مزاح سے انھیں خاصا لگاؤ ہے۔ان کے زیرِ مطالعہ مزاح کی کتب رہتی ہیں۔شہزادنیّر کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پہلی بیوی سے اور ایک بیٹی اور بیٹا دوسری بیوی کے بطن سے ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔خوش بخت فضہ ۱۹۹۸ء

۲۔ فیضان ۱۹۹۹ء

۳۔سوہا ۲۰۰۱ء

۴۔نعلین فاطمہ ۲۰۰۵ء

۵۔نہال ۲۰۰۶ء

شہزادنیّر اپنی بیگم اور اولاد کے ساتھ ایک خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ (۵)

ادبی سفر:

شہزادنیّر کو بچپن سے ہی اردو ادب میں دلچسپی تھی۔شہزادنیّر نے ساتویں جماعت سے شاعری کا آغاز کیا سب سے پہلے انہوں نے ایک پابند نظم لکھی۔ان کو شاعری سے خاصا لگاؤ تھا۔ان کی پہلی غزل اخبار ''نوائے وقت'' میں شائع ہوئی۔شاعری میں ماجد الباقری سے اصلاح لی پھر جان کاشمیری نے ان کی شاعری کی اصلاح کر کے ان کے حسن کو مزید نکھارا۔میٹرک تک انہوں نے کافی نظمیں اور غزلیں لکھ لی تھیں اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔فوج میں شمولیت سے پہلے ان کی بہت سی نظمیں اور غزلیں مختلف رسائل میں چھپتی رہیں۔فوج میں سلیکشن کے بعد بھی انہوں نے شعروشاعری کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔بہت سی نظمیں شہزادنیّر کی ملٹرس اکیڈمی کے رسالہ'' قیادت'' میں شائع ہوئیں۔انھوں نے کراچی، راولپنڈی، گوجرانوالہ، اسلام آباد، فیصل آباد، ملتان،

کشمیر، سرگودھا اور گجرات میں مشاعروں میں شرکت کر کے خوب داد وصول کی۔ ۲۰۰۱ء میں نظم ''سیاچن'' لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ شہزاد نیئر کا شعروشاعری کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ شہزاد نیئر حلقہ ارباب ذوق کے رکن ہیں۔ ان کو لسانیات پر عبور حاصل ہے۔ یہ ادب شناس شخصیت ہیں۔ ان کو ادبی حلقوں میں جانا بہت پسند ہے۔ یہ غالب، فیض، میراجی اور ن م راشد کی شاعری کو سراہتے ہیں۔ اردو شعروشاعری کو فروغ دینے کے لیے انھوں نے بہت سے مشاعرے کروائے ہیں تا کہ اردو ادب کو فروغ مل سکے۔ مختلف شہروں سے تعلق رکھنے والے شعراء ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور ان کے کلام سے مستفید ہوتے ہیں۔ ادبی خدمات میں ایک بڑا کارنامہ ان کا یہ ہے کہ انہوں نے گوناوالہ میں ایک پبلک لائبریری قائم کی اور آج بھی لوگ اس لائبریری سے مستفید ہوتے ہیں۔ شہزاد نیئر کی ادبی تخلیقات مختلف رسائل میں زائع ہوتی رہی ہیں۔ ان رسائل میں گونج، نوائے وقت، فنون، اوراق، ابلاغ اور قیادت شامل ہیں۔

شہزاد نیئر کا اہم اور بنیادی مشغلہ شاعری اور مطالعہ ہے۔ مطالعے کے بے حد شوقین ہیں۔ ان کو اردو، فارسی، انگریزی، ادب، تاریخ، فلسفہ، مذہبی متون، احادیث، بائبل اور بدھ مت، ان سب سے بھی رغبت ہے۔ وہ گانے کو نہ صرف سنتے ہیں بلکہ اس کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔

موسیقی کے متعلق شہزاد نیئر کہتے ہیں کہ:

> ''میں کوئی اور کام کرتے ہوئے موسیقی نہیں سنتا۔ کام چھوڑ کر
> آنکھیں بند کر کے خود کو سروں کے سمندر کی لہروں کے حوالے کر
> دیتا ہوں یقینی کریں یہ بہت بڑا تجربہ ہوتا ہے۔''(۶)

شہزاد نیّر کو اچھی موسیقی سے شغف ہے۔ ایسی موسیقی جس کے سُر تال ان کے ذہن کو سکون اور دل کو فرحت بخشیں، انھیں طمانیت کا احساس دلاتی ہے۔

ایوارڈز، اعزازات:

شہزاد نیئر ملکی اور غیر ملکی ادبی تنظیموں کی جانب سے بے شمار ایوارڈز اور اعزازی شیلڈ حاصل کر چکے

ہیں۔ایوارڈز درج ذیل ہیں۔

۱۔برفاب PEN انٹرنیشنل ایوارڈز ۲۰۱۰ء

۲۔صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایوارڈ، بدست منیر نیازی ۲۰۰۳ء

۳۔سفینہ ادب ایوارڈ ۲۰۰۸ء

۴۔فیض امن ایوارڈ ۲۰۱۰ء (انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان)

۵۔بزم اقبال ایوارڈ دبئی ۲۰۱۱ء

۶۔سخن ایوارڈ (صدائے سخن ادبی تنظیم) ۲۰۱۹ء

۷۔ریشم ڈائی ایوارڈ ۲۰۱۴ء (۷)

(ب) تصانیف

شہزاد نیئر کے تین شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔برفاب (۲۰۰۶ء)

شہزاد نیّر کی پہلی تصنیف برفاب کے نام سے کاغذی پیرہن پبلی کیشنز سے چھپی۔اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔تیسرا ایڈیشن سانجھ پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔یہ کتاب نظموں کا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں نظموں کی کُل تعداد ۳۳ ہے۔اس کتاب میں شہزاد نیّر کی طویل نظم خاک بھی شامل ہے۔برفاب میں ہر نوعیت کی نظمیں شامل ہیں۔رومانی، سیاسی، سماجی، نفسیاتی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی قسم کے موضوعات کی نظمیں شامل ہیں۔ان نظموں کی انفرادیت کی بنا پر ''برفاب'' کو پین ایوارڈ سے نوازا گیا۔

۲۔چاک سے اترے وجود (۲۰۰۹ء)

چاک سے اُترے وجود، شہزاد نیّر کی دوسری تصنیف ہے جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی۔یہ کتاب نظم اور

غزل دونوں اصناف پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں نُدرتِ فکر کے بہت اعلیٰ نمونے ملتے ہیں ۔ اس کتاب میں شہزاد نیّر نے انسانی نفسیات کے عمیق ادراک اور شعوری قوت کو بروئے کار لا کر شعر کی جلوہ گری کی ہے ۔ شہزاد نیّر کو جہاں جدید نظم میں انفرادیت حاصل ہے وہیں وہ غزل کے بھی ماہر نظر آتے ہیں ۔ اُن کی غزلوں میں محبوب کی جلوہ آرائیاں اور عشوہ طرازیاں ، معاشرے کی عکاسی ، جدیدیت ، عصرِ حاضر کا رنگ ، غرض سب خصوصیات اعلیٰ اور خوب صورت انداز میں نظر آتی ہیں اور شہزاد نیّر اپنے فن کی بلندی پر دکھائی دیتے ہیں ۔ شعر کا صحیح تاثر قاری تک پہنچانا اور اسے اپنے قلم کی گرفت میں لینے میں شہزاد نیّر کو ملکہ حاصل ہے ۔ نمونے کے اشعار دیکھیے :

؎ چلتے پھرتے اُسے بندش کا گماں تک نہ رہے
اُس نے انسان کو اس درجہ کشادہ باندھا

(۸)

مذکورہ شعر میں شہزاد نیّر نے بڑی خوب صورتی سے مسئلہ جبر و قدر کو بیان کیا ہے ۔ پہلے مصرع میں میں ''بندش'' اور دوسرے میں ''باندھا'' تلازمہ کاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں ۔ اسی کتاب میں سے چند ایک اور شعر دیکھیے :

؎ میں اضطرابِ زمانہ سے بچ نکلتا ہوں
تمھارے قول کو دل کا قرار کرتے ہوئے

(۹)

؎ اب جو اُجڑا ہے تو کچھ تم پہ تو الزام نہیں
قریۂ دل تھا مرا واقفِ بلا سے پہلے

(۱۰)

مختصر یہ کہ یہ کتاب تمام شعری خصوصیات لیے ہوئے ہے اور اپنی انھی اعلیٰ شعری خصوصیات کی بنا پر اسے عکس خوشبو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

۳۔گرہ کھلنے تک (۲۰۱۳ء)

''گرہ کُھلنے تک'' کی نظمیں نہ صرف موجودہ حالات کی عکّاسی کرتی ہیں بلکہ مستقبل کے حالات کی نمائندگی کرتی ہوئی بھی نظر آتی ہیں ۔ یہ کتاب الحمد پبلی کیشنز سے ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی ۔شہزاد نیّر کی یہ کتاب صرف نظموں پر مشتمل ہے ۔اس کتاب میں بھی وہ اپنی خدا داد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے فکری وفنّی حوالے سے عروج پر نظر آتے ہیں ۔

''گرہ کُھلنے تک'' کی نظموں میں شہزاد نیّر نے تشبیہات ، استعارات ، علامات کو اس احسن طریقے سے برتا ہے کہ عام قاری بھی شاعری کے اصل خیال تک بآسانی پہنچ سکے ۔اس کتاب میں شہزاد نیّر بہت سے داخلی اور خارجی واقعات سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں ۔شہزاد نیّر نے اپنی نظموں میں دورِ حاضر کی بھرپور عکاسی کی ہے ۔ان نظموں میں ''اساطیر''، ''تین اور تین سو''، ''لوحِ جہاں نما''، ''شبِ مے کشی کی سحر''، ''ٹیڑھی ترازو''، ''کس گھاٹ لگوں''، ''رب رانجھے ورگاں''، ''ہدایت کار'' اور ''نوحہ گر'' شامل ہیں ۔

ترجمہ نگاری

حال ہی میں انھوں نے ''ایڈورڈ ڈی بونو'' کی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے جو ترجمے کی خصوصیات اور مترجم کے فرائض پر پورا اترتا ہے ۔ (۱۱)

(ج) شخصیت

میجر شہزادنیّر ایک کثیر الجہت شخصیت ہیں۔ وہ خوش پوشاک، خوش گفتار اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ ان کا قد نکلتا ہوا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں بیضوی چشمے سے آراستہ، سیاہ گھنے بال، اور متناسب خدوخال کے مالک ہیں۔ ان کی طبیعت میں نرمی و گداز، تحمل اور بُردباری اور وقت کی قدر کرنے جیسی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وہ ایک انتہائی ذمے دار اور حساس انسان ہیں۔ اپنے بچوں اور بیوی سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ فطرت سے بے حد لگاؤ ہے اور مطالعے کا بھرپور ذوق۔ اپنی ہم سفر میں بھی انھی خصوصیات کو دیکھنا چاہتے تھے تبھی سیما فردوس کو ہم سفر چُنا۔ سیما فردوس کو بھی شاعری سے لگاؤ ہے اور مزاح ان کی پسندیدہ صنف ہے۔ اکثر مزاح کی کتب ان کے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔

شہزادنیّر ایک بہترین باپ ہیں اور اپنے جیون ساتھی کے لیے بہترین رفیق بھی۔ ان کے بچے ان سے ہر بات کُھل کر کرتے ہیں۔

شہزادنیّر کا اہم اور بنیادی مشغلہ شاعری اور مطالعہ ہے۔ مطالعے کے بے حد شوقین ہیں۔ ان کو اردو، فارسی، انگریزی، ادب، تاریخ، فلسفہ، مذہبی متون، احادیث، بائبل اور بدھ مت، ان سب سے بھی رغبت ہے۔ وہ گانے کو نہ صرف سنتے ہیں بلکہ اس کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔

موسیقی کے متعلق شہزادنیّر کہتے ہیں کہ:

> ''میں کوئی اور کام کرتے ہوئے موسیقی نہیں سنتا۔ کام چھوڑ کر آنکھیں بند کر کے خود کو سروں کے سمندر کی لہروں کے حوالے کر دیتا ہوں۔ یقین کریں یہ بہت بڑا تجربہ ہوتا ہے۔'' (۱۲)

شہزادنیّر کو موسیقی سے بے حد رغبت ہے۔ موسیقی ان کے لیے ایک بہت بڑا تجربہ ہے۔ ایسا تجربہ جو سکون بخشتا ہے اور روح اور ذہن کو مسحور کرتا ہے۔ موسیقی میں غلام علی، حسین بخش گلو اور سجاد علی کو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔

شہزادنیّر کھیلوں کے بھی شائق ہیں۔ کھیلوں میں انھیں تیراکی، والی بال اور بیڈمنٹن بے حد پسند ہیں۔

تیراکی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

شہزادنیّر کے مشاغل میں باغبانی بھی شامل ہے۔اپنے گھر میں انھوں نیا یک باغیچہ لگا رکھا ہے جس کی نگہداشت وہ بڑی محنت اور محبت سے کرتے ہیں۔اس باغیچے میں انھوں نے کئی طرح کی سبزیاں بھی کاشت کر رکھی ہیں۔

اگر کھانے کی بات کی جائے تو شہزادنیّر خوش خوراک واقع ہوئے ہیں۔نیّر صاحب کم کھانے اور اچھا کھانے کے قائل ہیں۔وہ زیادہ تر چٹخارے دار کھانے پسند کرتے ہیں اور ایسی چیزیں جو گوجرانوالہ کا خاصا ہیں مثلاً لسّی، دودھ، ساگ، مکھن، دال چاول اور مچھلی کا سالن، یہ سب ان کی مرغوب غذا ہیں۔شہزادنیّر کہتے ہیں:

''کھانا کم کھاتا ہوں اور وقت پر کھاتا ہوں، البتہ مزے دار پکا ہو تو بے اعتدالی بھی کر جاتا ہوں۔'' (۱۳)

اسلام آباد میں قیام کے دوران ان کے گھر میں روزانہ لسّی بنتی اور تازہ مکھن نکالا جاتا۔کیک، پیسٹری، ڈونٹ اور چپس وغیرہ سے وہ بے حد پرہیز کرتے ہیں۔

اگر ٹی وی اور فلمی پروگرامز کی بات کی جائے تو شہزادنیّر ٹاک شوز دیکھنے سے گریز کرتے ہیں۔شہزادنیّر کہتے ہیں کہ:

''ایسے شوز میں علمی سطح نا مناسب ہوتی ہے اور تجزیے انتہائی بودے ہوتے ہیں۔ عام مشاہداتی مغالطّوں کی بھرمار ہوتی ہے۔معروضی انداز میں بنائی گئی رپورٹس اور علمی گفتگو پسند آتی ہے۔'' (۱۴)

شہزادنیّر کو اس بات پر شکوہ ہے کہ اکثر رپورٹر اور میزبانوں کا اردو تلفّظ ان کے لیے رنجیدگی کا باعث ہے۔فلموں میں وہ تاریخی، سماجی اور رومانی فلموں کو پسند کرتے ہیں۔ایکشن فلمیں انھیں ذرا بھی پسند نہیں۔

شہزادنیّر کو مغرور اور بناوٹی لوگ بالکل نہیں پسند۔کُھلے ذہن کے مالک، سیکھنے سکھانے پر کمربستہ لوگ

انھیں پسند ہیں۔شاعروں،ادیبوں اورآرٹ سے تعلق رکھنے والوں کی صحبت میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔نظم کی دنیا میں ان کے پسندیدہ شاعروں میں ن۔م راشد، مجید امجد، میراجی ، ڈاکٹر وحید احمد اورنصیر احمد ناصر شامل ہیں۔جبکہ غزلوں میں انھیں میرتقی میر، غالب،منیر نیازی، احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد،شکیب جلالی،خورشید رضوی،سعودعثمانی،اختر عثمان،عباس تابش، ذولفقار عادل اورشاہین عباس متاثر کرتے ہیں۔

لاہور کی ادبی نشستوں میں ان کی ملاقات کافی پڑھے لکھے افراد سے ہوئی جو بعدازاں ان کے حلقہ احباب میں بھی شامل رہے۔ان میں احمد ندیم قاسمی،شہزاد احمد، خالد احمد اور وزیر آغا کی صحبت کافی اثر انداز ہوئی۔ان شعرااورادبا کی بدولت ان کی تحریرنکھرتی چلی گئی اورشعری قوّت اورآفاقیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

حوالہ جات

۱۔راقمہ کا شہزاد نیّر سے ٹیلی فونک رابطہ،۲۔ستمبر،۲۰۲۱ء۔وقت:4:26pm

۲۔ایضاً

۳۔ایضاً

۴۔https//shazadnayyer/criticism/google.com

۵۔ایضاً

۶۔ایضاً

۷۔ایضاً

۸۔شہزاد نیّر۔چاک سے اُترے وجود۔لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء۔ص ۷

۹۔ایضاً۔ص ۲۵

۱۰۔ایضاً

۱۱۔راقمہ کا شہزاد نیّر سے ٹیلی فونک رابطہ،۱۷۔ستمبر،۲۰۲۱ء۔وقت:8:00pm

۱۲۔ایضاً

۱۳۔https//shazadnayyer/criticism/google.com

۱۴۔ایضاً

باب دوُم

شہزاد نیّر کی نظم ’’خاک‘‘ کا فکری و اسلوبیاتی جائزہ

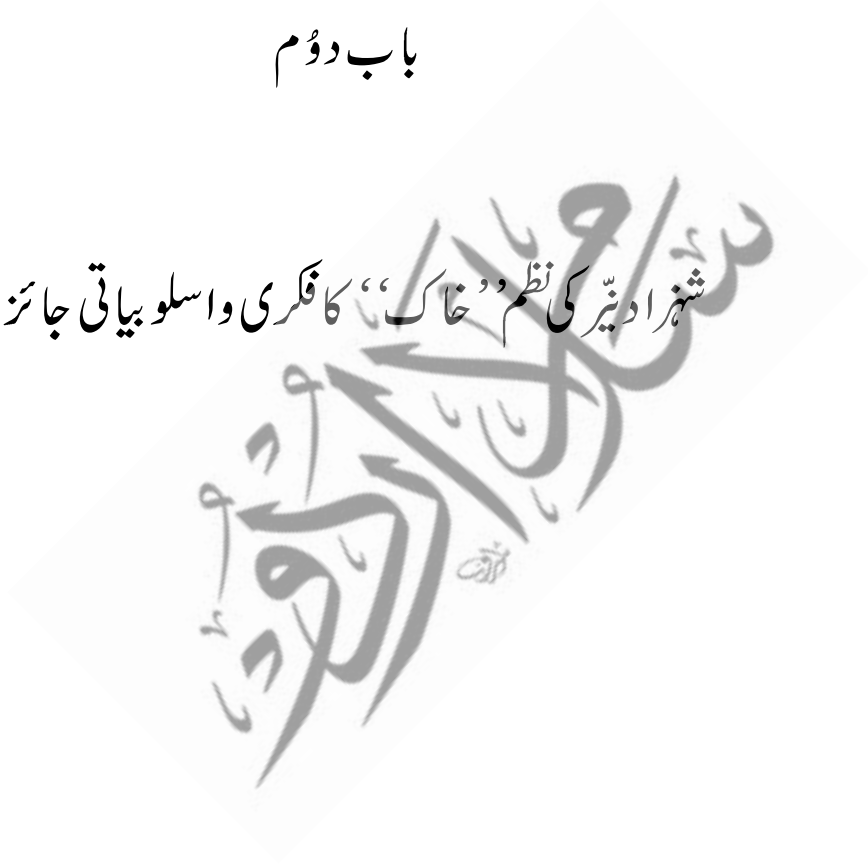

باب دوُم

شہزاد نیّر کی نظم ''خاک'' کا فکری و اسلوبیاتی جائزہ

آزاد نظم کا تعارف:

آزاد نظم کو انگریزی زبان میں فری وَرس (FREE VERSE) کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد ایسی نظم نہیں جو ہر طرح سے آزاد ہو۔ بلکہ آزاد نظم سے مراد ایسی نظم ہے جو قافیہ اور ردّیف سے آزاد ہو لیکن وزن اور بحر کی پابند ہو۔ بے ہئیت ہونے کے باوجود فری ورس کی ایک ہئیت ہے۔ جو نثر اور باضابطہ نظم دونوں کی خصوصیات کا امتزاج ہے۔ مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کی تعمیر و تشکیل وزن کی بجائے آہنگ سے ہوتی ہے جو جذبہ و خیال کی روش و رفتار کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے اور اس آہنگ کی اکائی رکن یا مصرعے کی بجائے اسٹرافی ہے جو ایک مصرع بھی ہو سکتی ہے۔ یہ چند مصرعوں کا مجموعہ بھی ہو سکتا ہے اور پوری نظم بھی۔ اسٹرافی کے آہنگ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں تمام مصرعے یا سطریں ایک دوسرے سے پیوست ہوتی ہیں جس کی وجہ سے الگ الگ مصرعوں کا آہنگ مختلف ہونے کے باوجود نظم کا ایک حاوی آہنگ ہوتا ہے۔ فری ورس کا آہنگ نہ تو باضابطہ نظم کا آہنگ ہوتا ہے نہ نثر کا اور نہ پُر آہنگ نثر کا۔ بلکہ اس کی ایک جداگانہ حیثیت ہوتی ہے۔ فری ورس میں چونکہ ہئیت مواد کے تابع ہوتی ہے اور آہنگ خیال کا ہم قدم ہوتا ہے، اس لیے اس کی ہئیت غیر متعین اور آہنگ متنوع ہوتا ہے۔ فری ورس کی طوالت کا انحصار خیال کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ یعنی مصرعوں کے چھوٹے بڑے ہونے کا دارومدار اس بات پر ہے کہ خیال میں وسعت ہے یا اختصار۔ یا یہ کہ بات کم کہی جانی ہے یا زیادہ۔ جہاں تک قافیے کا تعلق ہے تو آزاد نظم میں اس کی حیثیت فروعی ہے۔ یعنی عموماً قافیے کا ستعمال نہیں ہوتا۔ لیکن اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ان اصولوں اور ضابطوں سے آزاد ہونے کے باوجود آزاد نظم کو ''بے اصول'' کہنا زیادتی ہے۔ کیوں کہ اچھی اور مئوثر آزاد نظم بہر حال اصولوں کی پابند ہے اور شاعر باہر سے تھوپے ہوئے اصولوں کا پابند نہیں ہوتا بلکہ اپنے اصولوں کے تحت شاعری کرتا ہے اور وزن اور بحر کا پابند ہوتا ہے۔

اردو میں آزاد نظم کی روایت:

اردو میں آزاد نظم کے ارتقا پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ن۔م راشد کا شعری مجموعہ ''ماورا'' جو آزاد نظموں پر مشتمل ہے، ۱۹۴۱ء میں سامنے آیا۔ تصدق حسین خالد کا ''سرودِ نو'' ۱۹۴۷ء میں منظرِ عام پر آیا اور مجید امجد کا ''شبِ رفتہ'' آزاد نظموں کے تجربات کا سنگ میل بنا۔ دیگر شعرا میں میرا جی، فیض احمد

فیض، ساحرلدھیانوی، منیر نیازی، اسمٰعیل میرٹھی، احمد ندیم قاسمی اور اختر الایمان جیسے شعرا شامل ہیں جنھوں نے ہئیت کے تجربات کر کے آزاد نظم کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ موجودہ دور میں سعید مقصود، سلیم کوثر، ناصر شہزاد اور شہزاد نیّر جیسے شعرا آزاد نظم کی مقبولیت کا سبب بن رہے ہیں۔

نظم ''خاک'' کا اسلوبیاتی جائزہ:

شہزاد نیّر اردو ادب کے مایہ ناز شاعر، محقق اور نقّاد ہیں۔ شہزاد نیّر کا شاہکار، ان کی نظموں کا مجموعہ برفاب ہے جو لاہور سے سانجھ پبلیکیشنز کی طرف سے ۲۰۰۶ء میں منظرِ عام پر آیا اور جس نے مقبولیت کے ریکارڈ قائم کیے۔ یہ کتاب ۳۳ نظموں پر مشتمل ہے اور اس کتاب میں صرف نظمیں ملتی ہیں۔ اگر ان نظموں کی انفرادیت کی بات کی جائے تو برفاب میں ہر نوعیت کی نظمیں شامل ہیں جن میں سائنسی، معاشرتی، مذہبی، اخلاقی اور رومانی نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب میں طویل نظم ''خاک'' بھی شامل ہے۔ برفاب کو اپنی نظموں کی انفرایت کی بنا پر بین الاقوامی ادبی تنظیم نے ''پین ایوارڈ'' سے بھی نوازا۔ اب تک برفاب کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

برفاب کے معنی ''پگھلا ہوا پانی'' کے ہیں۔ اس کا منظوم پیش لفظ ''اعترافیہ'' شہزاد نیّر کی علمیت اور فنّی مہارت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ اعترافیہ میں حقیقت سندی کے بہت سے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس نظم میں موجودہ حالات کا نوحہ نظر آتا ہے۔ اس میں داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ خارجیت کا عنصر بھی شامل ہے۔ یہ نظم معاشرتی حقیقتوں کی عکاس ہے۔ مثال دیکھیے:

ہمارا دیکھنا کیا ہے
نظر ٹکنے نہیں پاتی
کہ ہر منظر بدلتا ہے
اگر منظر ٹھہر جائے تو آنکھیں وہ نہیں رہتیں
نگاہیں ریت ہیں
آنکھوں کی مٹھی سے پھسلتی ہیں
ہمیں دیکھو

قدیمی فلسفوں کے دشت میں خوسے بچھڑ کر

واہموں میں ڈھونڈتے

ہردم بھٹکتے ہیں

دماغ اِک میز پر رکھا ہے

آنکھیں فائلوں کے ڈھیر میں گُم ہیں

جہاں۔۔۔پوروں میں سمٹے ہیں

مگر ہم بٹ رہے ہیں (۱)

کہنے کو تو شہزاد نیّر نے ''اعترافیہ'' کو انتساب کے طور پر جگہ دی ہے مگر حقیقت سندی کی حیثیت سے اس کی فکری نوعیت ایک ناول کی طرح ہے جس طرح ایک ناول کُلی طور پر ایک معاشرے یا ماحول کے تمام موضوعات کو کرداروں کے ذریعے بے نقاب کر کے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح اعترافیہ میں بھی شہزاد نیّر نے اپنے ماحول، لوگوں، معاشرتی رویّوں، نظریات، رہن سہن، اور مصروفیات کو بہت عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ نظم اپنے حقیت پسندانہ انداز کے ساتھ فکر اور معنویت لیے ہوئے ہے۔ شہزاد نیّر لکھتے ہیں؛

حقیقت اس قدر ہے

درحقیقت کچھ نہیں

باقی فسانہ ہے

فسانہ جو کسی دل پر

مجھے لکھنا نہیں آتا (۲)

مادیت پسندی:

اس نظم میں شہزاد نیّر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یوں تو ہم دیکھنے میں روز بروز ترقی کے زینے طے

کرتے نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں کچھ اور ہے۔ اتنی ترقی کے باوجود ہماری روایتیں دم توڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ ستم تو یہ ہے اللہ پاک کی تقسیم پر انسان راضی نہیں۔ اللہ نے انسانوں کی برابری کی حیثیت عطا کی ہے لیکن انسان، انسانوں کو ہی تقسیم کرتا نظر آتا ہے۔ اس موضوع پر اعترافیہ کے مصرعے ملاحظہ ہوں:

سمٹتے فاصلوں میں

چھُپ کے بڑھتے فاصلوں میں

اک خدا کے نام پر تقسیم ہوتے لوگ (۳)

تنقیدِ حیات:

یہ حقیقت ہے کہ ادب اور معاشرے کا گہرا تعلق ہے۔ ادب کو تنقیدِ حیات کہا جاتا ہے اور ادب واقعتاً تنقیدِ حیات ہے۔ یہ بات ہمیں شہزاد نیّر کے فن پاروں میں بھی شدت سے دکھائی دیتی اور محسوس ہوتی ہے۔ شہزاد نیّر کا شعری مجموعہ ''برفاب'' کئی دنیاوی حقیقتوں کو بے نقاب کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اسلوب:

نظم ''خاک'' برفاب سے اخذ شدہ ہے جو طویل نظم ہے۔ اس نظم کے حوالے سے شہزاد نیّر کے مجموعی فکری وفنّی رویّوں کا جائزہ لیا جائے تو وہ ہمیں تعقل پسندی اور حسن کاری کے شوق میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ وہ درون اور بیرونِ ذات رونما ہونے والے واقعے کو فکر کی کسوٹی پر پرکھے بغیر سپردِ قلم نہیں کرتے۔ وہ واقعے کا تجزیہ کرتے ہیں جب کہ عموماً دیگر شعرا، واقعے کو تمثالوں میں اس طرح ڈھالتے ہیں کہ وہ اپنی ادنیٰ سطح سے اُٹھ کر نظم کی اعلیٰ سطح کو مَس کرتا دکھائی دیتا ہے۔

شہزاد نیّر کی بُنت کاری کے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ وہ جُدا جُدا اور مکمل مصرعوں کے ملاپ سے تدریجی مراحل طے کرنے والی آزاد نظم کی بجائے ایک دوسرے میں جذب ہوتے مصرعوں کے تسلسل سے تشکیل پاتی نظم کے قائل ہیں۔ مصرعوں کے باہم جُڑنے کا عمل اُن کی سبھی منظومات میں نمایاں ہے۔ اس اعتبار سے وہ میراجی کی نظم گوئی کی روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

اے اجل!

میں نے جی بھر کے بچوں کو دیکھا نہیں

گھر کی دھڑکن کو ترسے ہوئے کان جمنے لگے

میری دھڑکن میں تُو گھر کی دھڑکن ملا!

کچھ سلام آخری، کچھ پیام آخری

اپنے پیاروں کی خاطر لکھتا رہا

مری ماں اور بہنیں، مری آنکھ میں بین کرتی رہیں

یاد، آنکھوں کے گوشوں میں جمنے لگی (۴)

تمثیل نگاری:

شہزاد نیّر کی تمثالیں وحدانی ہیں۔ یعنی وہ خیال کی کسی ایک پرت کو تمثال در تمثال کی بجائے ایک ہی امیج کے ذریعے بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مصرع سازی میں بھی اسی سبب ایک سطر میں ایک ہی امیج بنتا نظر آتا ہے۔ مثال دیکھیے:

خونی یخ بستگی مُجھ پہ چھانے لگی

آس ہی ایک شعلہ تھا، بُجھنے لگا

موت۔۔سردی، حرارت۔۔حیات آفریں

سانپ سردی چلے، یخ گُویدہ بدن کو ڈسے

ریزہ ریزہ چُنے زندگی

ہونٹ پتھر ہوئے

اور صدا برف کے غار میں جم گئی

سوچ بھی سُن ہوئی

ٹھنڈے نیلے بدن سے حرارت کی قاشیں نکلنے لگیں

خون جمنے لگا، سانس رُکنے لگی

برف پنجرہ بنی، جسم قیدی ہُوا

برف کی کان میں برف ہوتا رہا

اور صدیاں خموشی سے چلتی رہیں

وقت کی مہربانی سے اُبھرا ہُوا میں

مہربانی کرو

گرم آغوش دھرتی کی دو مُجھے

ایک مٹی کی چادر ہی لے دو مُجھے (۵)

شہزاد نیّر کی تمثالوں کی ایک خصوصیت ان کا متحرک ہونا ہے۔ ساکن تمثالیں اُن کے ہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تاہم تمثالوں کی حرکت، دوڑنے کی بجائے سرکنے اور آہستہ آہستہ پیش قدمی کرنے کے قریب محسوس ہوتی ہے۔

فکری تجزیہ:

شہزاد نیّر کی نظموں کے موضوعات انسان کو درپیش آلام و مصائب، مسائل اور محرومیوں سے عبارت ہیں۔ وہ نظریاتی طور پر ترقی پسند نہ سہی، مگر ایک انسان دوست شاعر ہیں۔ ان کی شاعری انسانی رویّوں سے مزیّن ہے۔ کائنات کا دریافتی پھیلاؤ اور لمحہ بہ لمحہ بدلتے حالات شہزاد نیّر کو متاثر کرتے ہیں اور قلم اُٹھانے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں اس جانب بڑھنے کے اشارے تو ملتے ہیں مگر واضح پیش رفت دکھائی نہیں دیتی۔

شہزاد نیّر کی شعری کائنات میں اُن کی طویل ترین نظم ''خاک'' اپنے پورے جلال و جمال کو ظاہر کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اپنی نظم کے متعلق لکھتے ہیں:

''میری پہلی طویل نظم ''خاک'' میری پہلی نظمیہ کتاب ''برفاب''

(۲۰۰۶ء) میں شامل ہے۔اس کا کچھ حصہ محاذ سیاچن پر تعیناتی کے دوران لکھا گیا اور باقی بعد میں۔اس نظم کو مکمل ہونے میں لگ بھگ پانچ سال لگے اور اس کے نو ڈرافٹ لکھے گئے۔اس نظم پر بہت سے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے بات کی ہے۔ یہ نظم سیاچن کے برف پوش پس منظر میں امنِ عالم کی بات کرتی ہے۔کچھ وقت تو لگ جائے گا نظم پڑھنے میں لیکن امید ہے کہ یہ نظم آپ کو مایوس نہیں کرے گی۔'' (۶)

انسانی نفسیات:

شہزاد نیّر انسانی نفسیات کا عمیق ادراک رکھتے ہیں اور اس بات کا احساس ان کی نظمیں پڑھ کر قاری کو خود بہ خود ہو جاتا ہے۔شہزاد نیّر کی جدید اور طویل نظم خاک میں دو قدیم ممالک کے درمیان لڑی جانے والی جنگ کو موضوع بنایا ہے۔ان قدیم ممالک کے درمیان لڑی جانے والی جنگوں کے بعد کچھ لوگوں کو صدیوں پُرانی ایک لاش ملتی ہے جو مکمل برف سے ڈھکی ہوئی ہے۔شاعر نے اس لاش کو ایک عسکری کی لاش کے روپ میں پیش کیا ہے۔جو جنگ میں اپنے ساتھی عسکریوں سے اس وقت جُدا ہوا جب وہ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک رسے کے ذریعے محاذِ جنگ پہ برسرِ پیکار تھے۔مرکزی کردار سب سے آگے تھا۔موسم کی یلغار کے سبب تینوں ساتھیوں نے لقمۂ اجل بننے سے بچنے کے لیے اپنے ساتھی کی رسی کو کاٹ ڈالا اور یوں یہ عسکری ان سے جدا ہو گیا۔رسی کٹنے پر وہ گہری کھائی میں جا گرتا ہے۔پھر اس کے ساتھی کچھ دیر بعد اسے نیچے رسی پھینکتے ہیں کہ اسے پکڑ کر اوپر آ جائے۔نظم کے اس حصے میں یہاں فرشتۂ اجل کی آواز آتی ہے۔ برف بنا عسکری ایک مردہ انسان ہے لیکن شہزاد نیّر کی یہ کمال ہنرمندی ہے کہ وہ اس کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ مردہ انسان اپنی داستان خود سناتے دکھائی دیتا ہے اور اپنے ساتھیوں کو پیغام دیتا ہے کہ اس کے گھر والوں تک اس کا آخری سلام پہنچا دیا جائے۔

''خاک'' دراصل ایک خاکی وجود کے برف سے ہم کلام اور محوِ تصادم ہونے کی منظوم داستان ہے۔

مثال ملاحظہ ہو:

حیرتوں میں دبی چوٹیوں نے فلک کو جو دیکھا
تو گھٹنوں پہ سر رکھ کے رونے لگیں
اِک لڑائی جو تاریخ میں ایسے مرقوم ہے
پوری دُنیا میں بالاتریں اور بارِدتریں
بے شجر، بے ثمر منطقہ
بے ضرورت لڑائی کا میداں رہا!
مُنجمد جسم چلنے لگا
گرم مٹی کی چادر کی چاہت میں کھنچتا ہُوا
جُھولتا، جُھومتا چار شانوں پہ چلنے لگا
قیدِ یخ سے رہائی ملی
خاک، حدت کی جانب چلی! (۷)

اسلوب:

اس نظم میں برف اپنے تمام تر استعاراتی اور معنیاتی پھیلاؤ کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے۔ایک اور مثال دیکھیے:

مُنجمد عسکری
خامشی کی زباں میں عجب داستانیں سُنا تا رہا

برف روتی رہی

اپنے زخموں بھرے سُرخ ماضی کی یادیں پِروتی رہی

اپنی خاموشیوں کے حسیں تن سے چمٹے ہوئے

تیز بھالوں کی آواز کے زخم دھوتی رہی

صاف، ٹھنڈی ہواؤں میں گھُلتی ہوئی

باس بارود کی ماند پڑتی رہی

سنگ آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہے! (۸)

برف اور خاکی وجود کی باہم آمیزش و آویزش اور اس پر برف میں زیست کرنے کا عمل۔ اس عمل نے موت کو خاک اور خاک کو موت سے جوڑتی صورت کو حیات سے ملایا ہے۔ اس نظم کے مطالعے سے یہ بات متشرح ہوتی ہے کہ شہزاد نیّر نے برف کو ایک وسیع تناظر کی بے کیفی، اذیت، یکسانیت، جمود اور جبر کے معنوں میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ مثال دیکھیے:

برف کی اُجلی چادر پہ بارود کے کالے دھبے رہے

اُس میں دَن دَن کا، تڑتڑ کا اِک زہر تھا

اُس کے پانی میں بارود تھا، خون تھا نفرتیں تھیں

جو دریاؤں میں بہہ کے کھیتوں تک آئیں تو اُگنے لگیں

ضرب کھاتے ہوئے شرگزیدہ بشر کے بدن میں گھُلیں

سوچ میں جا بسیں

خون گھولا تو جنگیں ہوئیں

اختتامِ صدی کے کسی سال میں

برف زاروں میں پھر رزم گاہیں سجیں (۹)

شہزاد نیّر نے برف سے کئی اسرار و رموز و حیات و ذات اخذ کیے ہیں اور اپنا تعلق ابدی زندگی سے بحال رکھتے ہوئے دستِ مہر سے لمس اور حرارت طلب کیے ہیں۔ نظم کی بے جا طوالت اور یکسانیت نے اس خوب صورت نظم کے مجموعی تاثر پر برے اثرات مرتب کیے ہیں۔

''خاک'' کے حوالے سے مجموعی طور پر بات کی جائے تو حالات کی پیدا کردہ گھٹن، ہونے نہ ہونے کے وجودی بھید تک رسائی کی آرزو، بے مصرفیت کا کرب، زمانی تسلسل میں رائیگانی کا احساس، آفات کی صورت نازل ہونے والا جبر، سرحدوں کی حفاظت کے لیے عسکری جدّ و جہد اور زمینی تقسیم کی بے معنویت نظم خاک کے نمایاں موضوعات ہیں۔ شاعر کے لیے یہ ایک مشکل امر ہے کہ وہ داخلیت کی بجائے خارجیت کا مظاہرہ بھی حقیقت پسندانہ انداز میں کرے۔ لیکن شہزاد نیّر اپنے اس تجربے میں ہمیں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے معاشرتی حقائق کو بے نقاب کیا ہے اور اس خوبی سے کیا ہے کہ کہیں بھی نظم میں جھول اور تخیلاتی عنصر دکھائی نہیں دیتا۔ شہزاد نیّر کے ہاں مذہبی سادہ لوحی بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی نظموں سے مذہبی لگاؤ اور مذہب سے محبت کا درس ملتا ہے۔ شہزاد نیّر میں مذہبی شدّت پسندی نہیں۔ لیکن مذہب کی اہمیت ان کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ مثال دیکھیے:

بستیوں میں پھرے اور چاہے
اگر حکم دے دوں تو تعمیل کو بجھتے ملبے سے
لبّیک کی اونچی اونچی صدائیں اٹھیں! (۱۰)

امیجری:

شہزاد نیّر کا اسلوب دل کش، خوبصورت، سادہ اور دلفریب ہے۔ وہ قلم کا ایسا جادو جگاتے ہیں جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزاد نیّر کے ہاں امیجری بھی بھرپور انداز میں ملتی ہے۔ آزاد نظم کی سطور کی تراش

خراش دیکھ کر لگتا ہے کہ شہزاد نیّر نے طویل ریاضت کی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

؎ گڑگڑاہٹ ہوئی

بامِ کہسار سے سر دلاوے کے مانند بہتی

سماعت کی چھلنی سے ہوتے ہوئے

دل تک آئی تو دل جم گئے

گڑگڑاہٹ کے پہلو میں بہتے ہوئے

برف، پانی، ہوا (۱۱)

ایک اور مثال صنعتِ تجسیم کی دیکھیے:

؎ تُو بال کھولے ہر اِک گھر کی دہلیز پر

چیختی، ناچتی ہے

اجل! سُن رہی ہے؟ (۱۲)

ایک مثال اور دیکھیے:

؎ برف بڑھتی رہی

برف دھرتی کے سینے پہ تھوڑی دھرے

دھیمی دھیمی حرارت سے باتیں کرے (۱۳)

مکالماتی اسلوب:

مکالماتی رنگ اور خود کلامی شہزاد نیّر کی نظم خاک میں جا بجا ملتا ہے۔ یہ خود کلامی نظم کو مزید پُر اثر بناتے ہیں اور شہزاد نیّر کو بطور شاعر انفرادیت کے مقام پر لاتے ہیں۔ مثال دیکھیے:

زمیں کی ازل سے چارئی ہوئی آگ کی یاد میں
اک تسلسل سے اُٹھتی ہوئی
اپنے من میں بھرے
میٹھی میٹھی حرارت سے باتیں کرے
تھوڑی پگھلے
محبت بھرے لمس سے کچھ بہے
اور سرگوشیوں میں کہے، کچھ کہے (۱۴)

شہزاد نیّر انسانی جذبات کا گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے مرکزی فوجی کی زبان سے انسان کے جذبات و احساسات کی عکاسی کی ہے۔ کھائی میں گرا وہ فوجی زندگی کی آخری گھڑیاں گنتا ہے اور خاک کی بھیک مانگتا ہے کہ اسے مٹی کی ایک چادر اور اپنی دھرتی کی آغوش ہی میسر آجائے۔ خاک سے خاک کا دوبارہ جڑنا ہی اس نظم کا نقطۂ عروج ہے۔ شہزاد نیّر پاکستانی فوج میں ایک میجر کی حیثیت سے اپنی فوجی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اپنی طویل نظم خاک میں ایک فوجی کی زندگی کی تصویر کشی اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کی ہے۔ اس نظم میں شہزاد نیّر نے جذبات کا پیکر تراش کر تمثال نگاری کی مثال قائم کی ہے۔ کھائی میں گرے ہوئے فوجی کو برف، موت کی صورت نظر آتی ہے۔ ایک فوجی اپنے اہلِ خانہ کے لیے کس قسم کے جذبات سے دوچار ہوتا ہے اور اپنی عسکری زندگی میں کن دشواریوں کا سامنا کرتا ہے؟ اس کا جواب انھوں نے ایک فوجی کی زندگی کو فوجی کی زبانی ہی بیان کر دیا ہے۔ شہزاد نیّر نے اپنی نظم کو دلکشی عطا کرنے اور حسن سے نوازنے کے لیے اردگرد کی جزئیات اور برف پوش راستوں کے مناظر کی تصویر کشی کی ہے۔ اس ضمن میں نظم کا یہ حصہ دیکھیے:

سرد تیزی سے اوپر کو چڑھتی ہوئی

تنگ، پتھریلی، مڑتی ہوئی رہ گزر
برف میں نوکِ پا سے کھنچا ہوا راستہ
آبِ جو
جانے کن عجلتوں میں چلی
موڑ مڑتے ہوئے
اک ذرا تھم گئی
پھر وہیں جم گئی (۱۵)

تہذیبی شعور:

شہزاد نیّر کی نظمیں گہرے تہذیبی شعور کی حامل ہیں۔ تہذیبی شعور سے مراد سماج کا فہم ہے۔ تہذیبی شعور کے لیے تاریخی شعور ہونا لازمی ہے جو شہزاد نیّر کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ ہر خطے کی تہذیب الگ اور جدا ہے۔ تہذیبوں کو الگ کرنے میں سب سے اہم اور بنیادی اہمیت زبان کو حاصل ہے۔ ہر قوم کی تہذیب مختلف ہے۔ اسی طرح ہر معاشرے کی تہذیب بھی دوسرے معاشرے سے مختلف ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ہر گھر کی بھی الگ تہذیب ہے اور اسی کا نام تہذیبی شعور ہے۔ شہزاد نیّر نے اپنی نظم خاک میں ایک فوجی کی زندگی اور فوجی کلچر کو بیان کیا ہے۔ ایک فوجی، اپنی زندگی دوسروں کی خاطر داؤ پر لگا دیتا ہے لیکن اپنے ساتھی کی خاطر وہ کئی زندگیوں کو داؤ پر نہیں لگا سکتا ہے اور یہی اس نظم کا نظریہ ہے۔ کیوں کہ فوجیوں کے نزدیک:

سفر ہو، تبدّل ہو
یوں منجمد زندگی، آشنائے تغیّر ہو
ہلچل ہو، آواز ہو (۱۶)

مندرجہ بالا مصرعوں میں فوجیوں کی نفسیات کو بہت عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔شہزاد نیّر کی یہ فنّی چابکدستی ہے کہ وہ اپنی تمام شعری خصوصیات کو بروئے کار لا کر، کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔انسان جب دنیا سے آشنائی حاصل کر لیتا ہے تو یا تو وہ دنیا داری سے الگ ہو جاتا ہے یا اپنے آپ کو بہت زیادہ تجربہ کار اور باقی لاگوں سے خود کو برتر خیال کرنے لگتا ہے۔لیکن جوں جوں وہ شعور کی گہرائی سے کام لیتا ہے اور کائنات کو مسخر کرنے لگتا ہے توں توں اسے اپنا وجود چھوٹا اور نہ ہونے کے برابر دکھائی دیتا ہے۔شہزاد نیّر کے ساتھ بھی یہی کچھ معاملات ہیں۔ وہ انسان سے محبت کرنے کے قائل ہیں اور انسانیت کی ناقدری پر کُڑھتے ہیں۔ان کی شاعری انسانیت کا اور امن کا پیغام ہے۔مثال ملاحظہ ہو:

؎ جن کو دیکھا نہیں اُن زمینوں کی جانب بہے
کوہ کاٹے، چٹانوں میں رستہ بنائے
اُمنگوں سے لہرا کے، بل کھا کے چلتی رہے
نیچے اُترے تو میدان میں دھیرے دھیرے چلے
جنگلوں سے گزر ہو تو شاخوں کو چومے
انھیں حسن بخشے (۱۷)

محبت و انسانیت کا درس:

حسن اور حسنِ کائنات کو انسانی آنکھ نظر انداز نہیں کر سکتی۔حسن انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔حسن کے بغیر انسان ادھورا اور کائنات نامکمل ہے۔

؎ جنگلوں سے گزر ہو تو شاخوں کو چومے
انھیں حسن بخشے
بڑھے، ریگ زاروں کو جائے
تو پانی کی ترستی ہوئی آنکھ کو گدگدائے

مسرّت بنے، خوش کرے اور خوش ہو

وہیں جذب ہو (۱۸)

امید ورجائیت:

شہزاد نیّر ہمیں امید اور رجائیت پسند شاعر نظر آتے ہیں۔ وہ ہر شے سے مثبت پہلو تراشتے ہیں اور اسے سراہتے ہیں۔ وہ زندگی کی عینک کو اُمید بخشتے ہیں اور دنیا کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ امید اور امن ہی اس نظم کا پیغام ہے اور نظم کا مرکزی خیال بھی۔ رواں دواں رہنا، متحرک رہنا ہی زندگی کی علامت ہے۔ جب کہ سکون اور سکوت موت کی علامت ہے۔

سفر ہو، تبدّل ہو

یوں منجمد زندگی آشنائے تغیر ہو

ہلچل ہو، آوز ہو

کب تلک برف بن کر جمی ہی رہوں (۱۹)

ڈاکٹر آفتاب احمد کے نزدیک شہزاد نیّر ایک دکھے ہوئے دل کا شاعر ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کا دکھ ذاتی نہیں، بلکہ کائناتی ہے۔ ان کا دُکھ ایک انسان کا نہیں، بلکہ پوری انسانیت کا ہے۔ اس سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہمیں رجائیت پسند نظر آتے ہیں نہ کہ قنوطی۔ شہزاد نیّر کے ہاں اُداسی کا پہلو ضرور ملتا ہے لیکن جہاں یہ اُداسی نظر آتی ہے وہاں انسانی تعلقات کی بات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ نہ صرف انسانی تعلقات کی بات کرتے ہیں بلکہ تعلق کی گہری نفسیات کو بھی پرکھتے ہیں اور نفسیات کی رو سے ہی حل پیش کرتے ہیں۔ اُداسی کے ساتھ کہیں کہیں ہمیں بے گانگی کا احساس بھی ملتا ہے لیکن اس بے گانگی میں غصہ اور بے حسی نہیں بلکہ فکر کے جذبات موجزن ہیں۔

برف گرتی رہی، وقت ٹھہرا رہا
ان گنت سال سے ایک عمل جاری ہے
برف گھلتی رہے، کچھ پگھلتی رہے
سال بھر میں فقط چند پوریں
جسے ماپنا کارِ دُشوار ہے (۲۰)

شہزاد نیّر کی نظموں کی خصوصیت تنہائی اور خود فراموشی کے احساس ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ خود فراموشی محض نجی یا ذاتی نہیں بلکہ اس احساس نے قدرتی مناظر، زمین کے اونچے اونچے پیڑوں، آسمان کے چاند، ڈھلتی چاندنی، اُبھرتے سورج، جمتی برف اور برستی بوندوں سے مستعار لیا ہے۔ یہ عالمِ تنہائی، معاشرتی دُکھ، پانی کی بوندیں ہی ان کا اثاثہ ہیں۔ شہزاد نیّر لکھتے ہیں:

جو پتھر یہاں آج نکلا ہے، سینکڑوں سال پہلے
کہستاں کے تن سے جُدا ہو گیا تھا (۲۱)

شہزاد نیّر کی اُداسی کا تعلق محض ذات سے نہیں بلکہ تمام معاشرہ اس میں ان کا شریک کار ہے۔ انھوں نے ہمیں معاشرتی المیوں کو محسوس کرنا سکھایا ہے اور سب سے بڑھ کر فوجی کی زندگی میں رونما ہونے والے الم ناک واقعات کی رونمائی کی ہے۔ ایک فوجی اپنی زمین سے بہت دور ہوتا ہے۔ اپنی زمین چھوڑنا انسان کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ یہ صدیوں کے رشتے ناتے چھوڑنے اور ایک بالکل نئی زندگی کو ازسرِ نو شروع کرنے کا عمل اپناتا ہے اور بعض فوجی، نظم کے مرکزی فوجی کی طرح آخری وقت میں بھی گھر والوں کے دیدار سے محروم رہتے ہیں۔ نظم کے فوجی کے لیے برف، موت ہے۔

برف برزخ ہے، چیزیں بدلتی نہیں

وقت سے ماورا

اس میں چیزوں کی ہیئت زمانوں تلک ایک جیسی رہی

قرن ہا قرن پہلے کے آثار سب

جوں کے توں ہیں ہمارے لیے

برف کھڑکی ہے بیتے دنوں کی طرف

اس کا ملبوس تو عہدِ جنگ و جدل میں

تحارب کی پوشاک ہوتا تھا۔۔۔

ہاں، عسکری تھا یہ عہدِ گزشتہ کا (۲۲)

فوجی کی ماضی کی زندگی اپنے پورے حسن اور شان و شوکت کے ساتھ غرقِ برف ہوگئی۔ لیکن شہزاد نیّر نے اس کی زندگی کا ماتم نہیں منایا، نہ اس سے ملتے جلتے احساسات کو سُلگایا۔ بلکہ وہ موت کے عمل میں بھی زیست کا سامان ڈھونڈتے رہے۔ وہ اس عسکری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ہاں، عسکری تھا یہ عہدِ گزشتہ کا

جو اک ریاست کی جانب سے لڑتے ہوئے

برف حملے میں اک روز مارا گیا

یہ خموشی، یہ اس کا تقدّس

ہواؤں کی پاکیزگی دیکھتے ہو؟ (۲۲)

برف نے شہزاد نیّر کو اس لیے متاثر کیا کیوں کہ وہ عسکری کی جان کا روگ بن گئی۔ اس تجربے مقام اور وقت دونوں سے عسکری کی دوری ااور اجنبیت کے احساس کو بیک وقت مجتمع کر دیا۔ اگلے وقتوں اور پُرانی صبحوں کی یادیں عسکری کے لیے اندوختہ بن کر رہ گئیں تھیں۔ یہ عسکری مسافرت میں تمام عمر مقام اور وقت کی ایک دُنیا میں کھڑا، مقام اور وقت کی دوسری دُنیا کے خواب دیکھتا تھا لیکن اجل نے قیامت کا ظلم ڈھایا اور اسے اپنے خواب شرمندۂ تعبیر کرنے کی مُلت نہ دی۔ اپنے آخری وقت میں وہ اپنے ہی خاندان کو دیکھ نہ پایا اور محاذِ جنگ، موت کا میدان بنا۔ یہ جنگ دو ممالک کے درمیان تھی۔ شہزاد نیّر لکھتے ہیں:

چند خونی جنونی
کہ جو امن کو کو مقتدر رہنے کا ایک لفظی وسیلہ بناتے رہے
کیا عجب جنگ کو برف زاروں میں بھی لے گئے
یوں تو تاریخ میں ایسا لکھا ہوا ہے
کئی سال تک
دو قدیمی ممالک کی فوجیں
انھی برف زاروں میں لڑتی رہیں
آمنے سامنے
خود کو موسم کی زد سے بچاتے ہوئے
برف کو سرخ کرتی رہیں
جن پہ موسم نے پیچھے سے حملہ کیا
وہ وہیں جم گئے!

ایک موسم یہاں سال بھر

برف، سردی، ہوا

رات پُھنکارتی، روز سورج بنا

نقطۂ منجمد کے تلے جنگ لڑنے کو

بارود اور خاص ملبوس لے کر یہاں آ گئی تھی

اُسی عہدِ خوں میں

معاشی تنزّل کی یلغار میں

جنگ اور اس کے اسباب کتنے قوّی! (۲۳)

تبصرہ:

شہزاد نیّر کی نظم ''خاک'' موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ایک معیاری طویل نظم ہے۔ یہ نظم امیجری کی عمدہ مثال ہے اور تاریخی اور عصری شعور کی آئینہ دار ہے۔ شہزاد نیّر انسانی جذبات کا گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس نظم میں مرکزی فوجی کی زبان سے خاک کی بھیک مانگی ہے کہ اسے مٹی کی چادر اور اپنی دھرتی کی آغوش میسر آ جائے۔ خاک کا خاک سے دوبارہ جڑنے کا عمل ہی اس نظم کا نقطہ عروج ہے۔

حوالہ جات

۱۔شہزاد نیّر۔ برفاب۔لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء۔ص۲

۲۔ایضاً۔ص۲

۳۔ایضاً۔ص۴

۴۔ایضاً

۵۔ایضاً

۶۔راقمہ کا شہزاد نیّر سے ٹیلی فونک انٹرویو، ۲۶۔ستمبر، ۲۰۲۱ء۔وقت: ۴ بجے

۷۔شہزاد نیّر۔ برفاب۔لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء۔ص۶

۸۔ایضاً۔ص۸

۹۔ایضاً

۱۰۔ایضاً۔ص۱۱

۱۱۔ایضاً

۱۲۔ایضاً۔ص۱۵

۱۳۔ایضاً

۱۴۔ایضاً

۱۵۔ایضاً۔ص۱۶

۱۶۔ایضاً۔ص۱۸

۱۷۔ایضاً

۱۸۔ایضاً

۱۹۔ایضاً۔ص۲۰

۲۰۔شہزادنیّر۔برفاب۔ص۲۰

۲۱۔ایضاً۔ص۲۳

۲۲۔ایضاً۔ص۲۳

۲۴۔ایضاً۔ص۲۵

باب سوم

شہزاد نیّر کی نظم ''نوحہ گر'' کا فکری و اسلوبیاتی جائزہ

باب سوُم

شہزاد نیّر کی نظم ''نوحہ گر'' کا فکری و اسلوبیاتی جائزہ

نظم ''نوحہ گر'':

شہزاد نیّر کی نظم ''نوحہ گر'' ان کی کتاب ''گرہ کھُلنے تک'' میں مذکور ہے۔ ''گرہ کُھلنے تک'' کی نظمیں نہ صرف موجودہ حالات کی عکّاسی کرتی ہیں بلکہ مستقبل کے حالات کی نمائندگی کرتی ہوئی بھی نظر آتی ہیں۔ یہ کتاب الحمد پبلی کیشنز سے ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی۔ شہزاد نیّر کی یہ کتاب صرف نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں بھی وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے فکری وفنّی حوالے سے عروج پر نظر آتے ہیں۔

فکری اساس کے شاعر شہزاد نیّر:

شہزاد نیّر فکری اساس کے شاعر ہیں۔ فکر اساس شاعری تجربہ اساس شاعری سے مختلف اور الگ تصور رکھتی ہے۔ فکر اساس شاعری تجربے کو اپنی کسوٹی پر پرکھے بغیر تخلیقی عمل کے سپرد نہیں کرتی۔ فکر اساس شاعری جلوہ نما کثرت میں کسی پنہاں وحدت کا سراغ ضرور دے جاتی ہے جس تک رسائی کے بعد مفرد تخلیقات کے مختلف رنگ برنگے موتی ایک تار میں پروئے نظر آتے ہیں۔ شہزاد نیّر کے کلام کی یہ خوبی ہے کہ اس میں جلوہ نما کثرت ہمیشہ کسی وحدت کی جانب کھینچتی نظر آتی ہے۔

طویل نظم کی روایت:

شہزاد نیّر کی زیرِ تجزیہ نظم ''نوحہ گر'' ان کی دوسری طویل ترین نظم ہے۔ طویل نظم سے مراد ایسی نظم ہے جس میں ایک عنوان مختصر نظم ہی کی طرح دیا گیا ہوتا ہے اور اس نظم کو بہت سے اشعار اور بندوں کی صورت میں تحریر کیا جاتا ہے۔ جہاں نظم کہنا ایک مکمل کیفیت اور رجحان کا نام ہے جو فن پر دسترس، مشاہدہ، مطالعہ، احساسِ قلبی و باطنی اور دور اندیشی کو وعت دینے کا نام ہے وہیں طویل نظم کہنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

ایڈگر ایلن پو کے مطابق:

''ہم جس چیز کو طویل نظم کہتے ہیں وہ دراصل مختلف نظموں کا
سلسلہ ہوتا ہے یعنی مختصر شاعرانہ تاثرات کا۔'' (۱)

دیگر زبانوں میں طویل نظم کی الگ تاریخ اور روایت ہے۔جن علاقوں میں طویل نظم لکھنے اور پڑھنے کا رواج ہے وہاں کی نسبت اردو کی طویل نظم کی روایت ماضی قریب میں شروع ہوتی ہے۔شعری تجربہ تہہ در تہہ اس کی کئی سطحیں ہوتی ہیں اور ایک سطح سامنے آئے تو نظم تخلیق ہوتی ہے۔طویل نظم میں وہ ساری سطوح سمٹ آتی ہیں۔نسیم عبدالمجید طویل نظم کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''طویل نظم سے مراد ایسی نظم ہے جو اوسط درجے کی ضخامت
سے بھی آگے بڑھ جائے جس کو شاعر نے فنّی مہارت سے پھیلا
دیا ہو۔نظم کی جہت باہر سے اندر کی طرف ہے۔نظم اس مکمل
شخصیت کا اظہار ہے جو قوّت اور تازگی حاصل کرنے کے لیے
غوطہ لگانے کے لیے مجبور کرتی ہے اور اس کے لیے اس کی جہت
باہر سے اندر کی طرف ہے۔'' (۲)

نظم نگاری ایک علیحدہ صنف سخن کی حیثیت سے ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے مشاعروں سے وجود میں آئی۔انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے جدید اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ان کی کوششوں سے لے کر علامہ اقبال کے کلام تک اردو نظم نگاری مختلف حالات و واقعات سے گزری۔قیامِ پاکستان کے بعد نظم کو فروغ دینے میں ترقی پسند تحریک، حلقہ اربابِ ذوق اور لسانی تشکیلات کی تحریک نے نمایاں کردار ادا کیا۔اردو نظم کی دو جہتیں ہیں۔ پہلی جہت میں آزاؔد، حالؔی، شبلؔی، اسمٰعیل میرٹھؔی، اکبرالہٰ آبادی اور محمد دین تاثیر شامل ہیں۔انھوں نے قومی اور ملی نظمیں لکھیں۔دوسری جہت میں جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی اور احسان دانش شامل ہیں۔ دوسری جہت، پہلی جہت کا ردّعمل تھی۔انھوں نے رومانی نظمیں لکھیں۔لیکن علامہ اقبال نے ان دونوں جہات کی درمیانی کڑی کو اپنایا۔اقبال نے نظم کو خارجی زندگی کے بیان کے علاوہ داخلی زندگی کی عکاسی کے لیے استعمال

کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک نے گرد و پیش کو اپنی لپیٹ میں لے کر خارجی زندگی کا عمل تیز کر دیا۔ سامراج، جاگیرداری اور سرمایہ داری نے انسان کو جن مسائل کا امیر بنایا تھا ان مسائل کا ذکر انسان کے نفسیاتی اور جنسی الجھنوں کا بیان ترقی پسند شعرا کی نظموں میں نظر آتا ہے جن میں فیض احمد فیضؔ، احمد ندیم قاسمی، حبیب جالب، احمد فراز، افتخار عارف اور فہمیدہ ریاض شامل ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''ترقی پسند شاعری میں زندگی کے خارج کو موضوع بنانے اور قاری کو براہِ راست مخاطب کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔ اس تحریک نے زندگی کی حریت کو طنز کا نشانہ بنایا اور شاعر کو اس کے خلاف اونچی آواز میں احتجاج کرنے کی دعوت دی۔'' (۳)

حلقہ اربابِ ذوق، ترقی پسند تحریک کے ردِّعمل کے طور پر سامنے آئی۔ یہ دونوں تحریکیں ایک ہی زمانے میں پروان چڑھیں اور رومانی تحریک کے بطن سے پھوٹیں۔ حلقہ ارباب ذوق دو شاخوں، ادبی اور سیاسی تحریک میں تقسیم ہوئی۔ سیاسی تحریک جلد دم توڑ گئی جبکہ ادبی تحریک راولپنڈی، اسلام آباد، لاہور، فیصل آباد اور دیگر شہروں میں قائم ہے۔ حلقہ ارباب کے شعرا کی شاعری میں داخلیت اور خارجیت کا خوبصورت امتزاج اور توازن ملتا ہے۔ اس تحریک کے زیرِ اثر نظم نگاروں میں میراجی اور ن۔م راشد شامل ہیں۔ تصدق حسین خالد نے پرانی ہیئت کو رد کر کے آزاد نظم کی داغ بیل ڈالی۔ ڈاکٹر رشید امجد اپنی کتاب ''پاکستانی ادب'' میں لکھتے ہیں:

''حلقہ ارباب ذوق اگرچہ باقاعدہ تحریک نہ تھی لیکن اب رجحان اور رویے کے طور پر اس کے اثرات بھی گہرے ہیں اور اس حلقے کو ترقی پسند تحریک کا ردِّعمل سمجھا گیا۔'' (۴)

قیامِ پاکستان سے قبل اردو نظم ترقی کی راہ پر گامزن ہو چکی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۸ء میں

ایّوب خان کے مارشل لا نے بہت گہرا اثر ڈالا۔لوگوں کی زندگی نے ایک ایسا رُخ اختیار کرلیا جو اردو نظم میں مایوسی، اور احساس آزادی کی نفی کرتا ہوا نظر آتا۔اس دور میں اظہار پر پابندی لگ گئی۔ ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے نے عدم تحفظ، جبر وتشدد، زبان بندی اور خوف کے مسئلے کو جنم دیا۔شاعری الفاظ کا گورکھ دھندہ بن گئی۔یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد کی نظم میں نمایاں موضوع فسادات تھا۔اس دور کی نظموں میں مایوسی، زمانے کے انتشار، حالات کی ابتری، فسادات اور شکستگی کے عناصر واضح نظر آتے ہیں۔

ساٹھ کی دہائی میں نئی شاعری کی تحریک منظّم ہونا شروع ہوئی جسے لسانی تشکیلات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس تحریک سے وابستہ شاعروں جیلانی کامران، افتخار جالب اور سلیم الرحمان نے اپنی نظموں میں زبان کو روایتی انداز سے ہٹ کر استعمال کیا۔انھوں نے موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق اردو نظم میں نئی لفظیات، تمثال نگاری اور داخلی آہنگ کے سانچوں کا اضافہ کیا۔لسانی تشکیلات کا نظریہ زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔یہ تحریک جوش وخروش سے اٹھی لیکن ۱۹۶۵ء کا منظر نامہ بدلنے پر یہ تحریک دم توڑ گئی۔رشید امجد اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''ہماری قومی زندگی کو ایک ہزار سال کا فکری زوال ورثے میں ملا تھا۔یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہم نے اپنی قومی زندگی میں سوالوں کا انتخاب کیا اور نہ نظم میں۔۔۔نئی نظم کے سفر میں تین بڑے سیاسی موڑ ہیں۔ ۱۹۵۷ء کا انقلاب، ۱۹۶۸ء کی عوامی تحریک اور ۱۹۷۱ء میں المیہ مشرقی پاکستان۔'' (۵)

ستر کے بعد اردو نظم نے ایک اور کروٹ بدلی۔نئی وطنی صورت حال، اور سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے شاعروں نے حب الوطنی کے جذبات سے لبریز نظمیں لکھیں۔اسی کی دہائی میں اردو نظم میں جمود نظر آتا ہے۔اس دہائی کے شعرا نے نظم وسیع موضوعات سے نوازا۔ان شاعروں نے جلد ہی نظم میں اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کیا۔

طویل نظموں کی بات کی جائے تو اردو کی طویل نظمیں سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور فطری ضرورت جیسے موضوعات پر مبنی ہے۔ اردو کی طویل نظم کا مزاج اردو کی مختلف اصناف سخن کے خمیر سے بنا ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک منفرد صنف ہے جس کا تخلیقی مزاج جداگانہ ہے۔ اردو کی طویل نظم پر مرثیہ اور مثنوی کی گہری چھاپ ہے۔ یہ طویل نظم مادی حالات اور فطری ضروریات کی دین ہے۔ یہ تدریجی طور پر ارتقائی عمل کی مختلف منزلوں سے گزرتی رہی۔ بقول شمس الرحمان فاروقی:

> ''طویل نظم کے دو طرح کے جواز ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ کے پاس کوئی Narative theme ہے، کوئی بیانیہ، کوئی کہانی، کوئی واقعہ جیسے سحر البیان۔ دوسرا ہو سکتا ہے کہ کوئی شخصیت ایسے theme کا اظہار کرنا چاہے جو Meditative ہو۔ جس میں حیات و کائنات کے کسی ایک بڑے مسئلے یا ذات کائنات کے بڑے مسائل پر اظہار کرنا مقصود ہو Meditative tone میں۔'' (۶)

اردو ادب میں طویل نظم کی دنیا سمٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ اردو ادب میں طویل نظمیں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ مگر جتنی بھی طویل نظمیں آزادی کے منظر نامے پر لکھی گئیں، کلاسیکیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی ''پرچھائیاں''، جان نثار اختر کی ''امن نامہ''، جگن ناتھ آزاد کی ''وطن میں اجنبی''، ابنِ انشا کی 'مضافات''، فیض کی ''صبحِ آزادی'' اور اقبال کی ''ساقی نامہ'' اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

اردو ادب میں طویل نظم نگاری کا میلان عہدِ حاضر میں بھی پایا جاتا ہے۔ طویل نظم نگاروں میں ن۔م راشد، وزیر آغا، جیلانی کامران، اختر حسین جعفری، احید احمد اور جدید شعرا میں روش ندیم، فاخرہ بتول، خلیق الرحمان اور شہزاد نیّر اعلیٰ پائے کے نظم نگار ہیں۔

شہزاد نیّر کی پہلی طویل ترین نظم خاک ہے۔ نظم ''خاک'' تعمیریت سے زیادہ تخلیقیت پر آمادہ دکھائی دیتی

ہے۔ البتہ ''نوحہ گر'' میں ان کا رویہ قدرے مختلف ہے۔ یہاں تعمیریت کی مقدار تخلیقیت سے خاصی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظم ارتباط اور انتظام میں پچھلی نظم کے مقابلے میں سبقت حاصل کیے ہوئے ہے۔ یہ نظم استعاروں کے وفورِ تخلیق کی بجائے فکر کے تشکیلی محرّک کے زیرِ اثر پروان چڑھتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ کائناتی نظر کے تناظر میں مذہبی اعتقادات کا محاسبہ پیش کرتی ہے اور انسانی خون ریزی کے درپردہ سبب کے طور پر مذہبی اعتقاد کی موجودگی ثابت کرتی ہے۔

یہ نظم سائنسی نظریات کے تناظر میں تخلیقِ کائنات کے عمل سے آغاز کرتی ہے اور اس کے بعد اساطیر کی روشنی میں، انسانی اور تہذیبِ انسانی کے سفر کو کہیں سائنسی، کہیں مادی جدلیت اور کہیں خالص تخیلاتی تناظر میں شعری قالب میں ڈھالتی چلی جاتی ہے اور استعارے اپنی معنویت کو اسی فکری پس منظر کی تحدید میں ڈھلتے دکھائی دیتے ہیں۔

شہزاد نیّر نے اپنی نظم نگاری کا آغاز آزاد نظم سے کیا۔ ان کے ہاں موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ یہ نظمیں ان کے جذبات کی بے خوف آواز ہیں۔ شہزاد نیّر نوحہ گر میں کائنات کی تخلیق اور انسانی تاریخ کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس نظم میں تخلیقِ کائنات، تخلیقِ آدم، انسانی شعور، مختلف تاریخی واقعات، انسان کے ارتقا کی تاریخ، تصورِ موت، قتل و غارت، جبر، نابودیت، نوحہ گری، تصورِ وجودیت، تصورِ غم اور انفرادیت سے اجتماعیت تک کی آواز کے تمام موضوعات کا بیان کیا گیا ہے۔ بقول یوسف حسین:

> ''شہزاد نیّر کے موضوعات شخصی محبت سے لے کر طبقاتی، قومی اور عالمی، مختلف سطحوں کی سماجی آفاقیت تک پھیلے ہوئے ہیں اور وہ مکانی اور زمانی دونوں جہات میں دور تک دیکھنے اور جاننے کے لیے متجسس نظر آتے ہیں۔ (۷)

نظم میں شاعر نے وقت کی زبانی اس کائنات کے وجود میں آنے اور زمین پر زندگی کے آغاز کے حوالے سے واقعات بیان کیے ہیں۔ شہزاد نیّر کہتے ہیں کہ پہلے خلا میں کوئی وجود نہ تھا۔ ہر طرف اندھیرا، تاریکی،

ظلمت کے سائے اور خالی پن تھا۔ پھر اچانک ''کچھ نہیں'' سے ''بہت کچھ'' وجود میں آیا۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ نہ ہونے کی بے جسم آغوش میں۔۔
بے زمانی کے پہلو بچھے خالی پن میں
کچھ بھی نہ تھا۔۔ (۸)

تخلیقِ کائنات:

شہزاد نیّر نے تخلیقِ کائنات کی بنیاد بِگ بینگ تھیوری اور سٹیفن ہاکنگ کی تھیوری کو قرار دیا ہے۔ یعنی، کائنات کی تخلیق کے بارے میں ان کا نکتہ نظر سائنسی ہے۔ بگ بینگ تھیوری کے مطابق ابتدا میں کائنات ایک عظیم گولے کی صورت میں تھی جس کا درجہ حرارت بہت زیادہ تھا۔ جب یہ درجہ حرارت مزید بڑھا تو ایک دھماکہ ہوا جس کے چیتھڑے فضا میں بکھر گئے۔ دھماکوں کا یہ سلسلہ چلتا رہا جس سے کائناتی اجسام بنتے رہے۔ مثال دیکھیے:

؎ بس اک لمحے کا پھسلاؤ۔۔
سمت آشنا غیر مادے سے ٹکراؤ
نقطے کا پھیلاؤ ہونے میں بدلا
تو کچھ وقت تھا۔۔۔ کچھ جگہ (۹)

یونانیوں کا کائنات کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ یہ کائنات چار عناصر یعنی پانی، مٹی، ہوا اور آگ سے تشکیل پائی ہے۔ شہزاد نیّر اس بات سے مکمل اکتفا کرتے ہیں۔ اسی طرح سٹیفن ہاکنگ کی تھیوری کو موضوعِ بحث

بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ کائنات جب سے بنی تب سے غبارے کی نشو ونما کی طرح مسلسل پھیل رہی ہے ۔ پہلے ساری کائنات سیک نقطے میں سموئی ہوئی تھی پھر ایک عظیم دھماکے کے بعد اس کا وجود عمل میں آیا۔تب سے وقت کا آغاز ہوا۔اس سے قبل وقت کی تشریح ممکن نہیں کیوں کہ غیر متغیّر کائنات میں وقت کا آغاز کائنات کے باہر سے مسلّط کیا جاسکتا ہے ۔ایسی کائنات جو تغیّر سے عاری ہو، اس میں آغاز کی کوئی طبعی ضرورت نہیں ہوسکتی ۔ بقول دانیال طریر:

> ''یہ نظم سائنسی تعقلات کے تناظر میں تخلیقِ کائنات کے عمل سے آغاز کرتی ہے اور اس کے بعد اساطیر کی روشنی میں انسانی تہذیبی سفر کو کہیں سائنسی ،کہیں مادی جدلیت اور کہیں خالص تخیلاتی تناظر میں شعری قالب میں ڈھالتی چلی جاتی ہے اور استعارے اپنی معنویت کو اسی فکری پس منظر کی تحدیدات میں ڈھالتے محسوس ہوتے ہیں۔'' (۱۰)

کائنات اور اس کے مظاہر کے بارے میں ہر دور کا انسان سوچتا رہا کہ یہ کائنات کیسے اور کب وجود میں آئی ؟ یہ ایسی کیوں ہے؟ انسان کے ذہن میں طرح طرح کے سوال اُبھرتے ۔کیا اس کائنات کا کوئی خالق ہے؟ کیا وقت پیچھے کی طرف چل سکتا ہے؟ یہ کائنات کیا ہمیشہ یوں ہی چلتی رہے گی ؟ آیا اس کا کوئی انجام بھی ہے؟ وقت گزرتا رہا اور انسان تجربہ کرتا رہا۔انسانی تجربے کے مطابق وقت ایک ایسے بہاؤ کا نام ہے جس کی رفتار ناقابلِ فہم ہے ۔بقول ڈاکٹر محمود علی سڈنی:

> ''محض عدم سے فضا کے وجود میں آنے کا خیال ایسا نازک ہے کہ بہت سے لوگ اس کے سمجھنے میں دقّت محسوس کرتے ہیں ۔ بالخصوص جب وہ ایسے تصور کے عادی ہوں کہ فضا کچھ نہیں ہے ۔لیکن طبیعات دان فضا کو بجائے خلا کے ایک میڈیم سمجھتے

ہیں ۔ان کی نظر میں عدم سے مراد وہ حالت ہے جہاں نہ مادہ ہوا اور نہ فضا۔ اس نظریے میں اور بھی حیرت انگیز واقعات مخفی ہیں ۔فضا اور وقت آپس میں بری طرح اُلجھے ہوئے ہیں ۔جس طرح فضا پھیلتی اور سکڑتی ہے اسی طرح وقت ہے ۔ بگ بینگ سے جس طرح فضا پیدا ہوئی اسی طرح وقت بھی پیدا ہوا۔''(۱۱)

شہزاد نیّر بھی اسی بات کے قاء ہیں کہ وقت ، بگ بینگ کے ساتھ ہی وجود میں آیا۔مثال دیکھیے :

؎وقت بہتا رہا

میں وہیں تھا

مجھے اَدھ کٹے جسم گننے کی تفویض تھی (۱۲)

نوحہ گر کائنات کے آغاز سے اب تک کے تمام مظالم کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے ۔نظم نگار وقت کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان پرانے زخم بھول جاتا ہے ۔ وقت کا کام گزرنا ہے ۔ یہ ہر لمحہ گزرتا چلا جاتا ہے ۔ وقت کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتا ۔ ہم اسے نہیں دیکھ سکتے لیکن یہ ہمیں ہر لمحہ دیکھتا اور آزماتا ہے ۔نوحہ گر اس نظم میں ایک خیالی کردار ہے ۔ وہ تاریخ کے دشت میں شدّتِ غم سے نڈھال ہے ۔ وہ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ وقت کسی کے لیے نہیں ٹھہرتا ۔ جو لوگ مجھ سے تاریخِ انسانی سن رہے ہیں ، ایک ہو جائیں ۔ کلام ملاحظہ ہو:

؎سار بانو! شتر روک لو

کاروانو! یہی دشت ہے

دائیں بائیں نہ آنکھیں مسافت کریں

تم مجھے دیکھ نہیں سکتے (۱۳)

یہی وہ گر ہے جو انسان کو اس کی اصل سے روشناس کرواتا ہے اور اسی گر کو سمجھانے کے لیے شہزاد نیّر نے یہ نظم ''نوحہ گر'' تخلیق کی۔

شہزاد نیّر، نوحہ گر میں قدیم سے جدید تک کے تمام مظاہر کا مشاہدہ بخوبی کرتے ہیں۔ یہ نظم قدیم سے جدید تک کا سفرنامہ ہے۔ کیوں کہ نظم میں ایک جانب نوحہ پڑھا گیا جو بغاوت کے ساتھ حق کے امکان کا ایک واضح ثبوت ہے۔ دوسری جانب تاریخی ترتیب کو خاص توازن کے ساتھ برتا گیا ہے۔ نظم میں تواریخ کا مشاہداتی مظاہرہ ایسے کیا گیا ہے جیسے شاعر ''کُن'' سے اب تک کے مراحل کے عینی شاہد ہوں۔ انسان کی پیدائش سے لے کر دورِ جدید تک کے حالات جس طرح سے شہزاد نیّر نے قلم بند کیے ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے انسانی تاریخ و تہذیب کے کئی سفّاک رویے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔ سعید ابراہیم کے خیال میں:

> ''شہزاد نیّر کی طویل ترین نظم نوحہ گر ان کے رچے بسے تاریخی اور عصری شعور کا باکمال شاعرانہ اظہار ہے۔ جس میں انھوں نے کمال مہارت بے قید وقت کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔''(۱۴)

موضوعات:

ایک لکھاری معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ اپنے حالات و واقعات کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کا ہر شعر معاشرے میں بسنے والے افراد کے دل کی آواز ہوتا ہے۔ یہ اپنی شاعری سے دنیا کی عکاسی کرتا ہے۔ نظم نوحہ گر میں شاعر کا کردار قدیم دور سے جدید دور تک کی ہونے والی تمام قتل و غارت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور نوحہ گری کرتا ہے کہ کیسے انسان نے انسان کو کبھی خود غرض بن کر، کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی خدا کے نام پر قتل کیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے جب ایران، شام اور مصر پر حملہ کیا تو کئی لوگ جان کی بازی ہار

بیٹھے۔کئی گھرا جڑ گئے اور کئی بچے یتیم ہوئے۔عیسائیوں نے مسلمانوں کو ترکی اور سپین میں قتل کیا۔ ہندوؤں نے بُدھ مت کا قتل کیا۔ بدھ مت نے برما کا قتل کیا۔اسی طرح صلیبی جنگوں میں کئی لوگ مارے گئے۔کلام سے مثال ملاحظہ ہو:

؎ بہت قتل ہوتے رہے

لوگ میرے تیرے نام پر

قتل کرتے رہے، قتل ہوتے رہے

تیرے چرنوں پہ چڑھتے چڑھاوے لہو رنگ ہیں (۱۵)

شہزاد نیّر مختلف زمانوں میں انسانوں پر ہونے والے ظلم کا ذکر دردناک انداز میں کرتے ہیں۔ ہندو مذہب میں عورتوں کو شوہر کی چتا کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا۔وہ خدا جسے دیکھا نہیں جا سکتا، اس کے نام پر ہزاروں خدا بنے بیٹھے تھے جو عورتوں کو ظلم کا نشانہ بناتے تھے۔خدا کے نام پر سب نے اپنا اپنا مذہب بنا رکھا ہے۔ ہر مذہب ، دوسرے مذہب کا خاتمہ چاہتا ہے اور اس مذہب کے ماننے والے کو اپنے مذہب میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ نہ شامل ہونے والے کو قتل کر دیا جاتا ہے۔

؎ سو وہ تلوار کی نوک پہ حکم لکھتے چلے

سارے منکر سروں کو اڑاتے ہوئے (۱۶)

سعید ابراہیم کی اس نظم کے بارے میں رائے ہے:

’’یہ نظم کہانی ہے نیستی سے ہستی ہونے کی اور پھر ہستی کے بستی

بسانے کی ، خوف کی زمین سے دیوتاؤں کی فصل اُگانے اور

دیوتاؤں کو ایک خدا میں سمانے کی اور پھر آباد بستیوں کو مذہب

کے نام پہ برباد کرنے کی۔'' (۱۷)

اس نظم میں نابودیت کا موضوع ملتا ہے۔ نابودیت یعنی Non-existence۔ یہ ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے جس میں اشیا نا موجود اے موجود میں آتی ہیں یا پھر اپنا وجود کھو دیتی ہیں۔ یہ موت کے بعد مکمل فنا پذیری کا نظریہ ہے۔ جس کے مطابق انسان مکمل طور پر فنا ہو جائے گا۔ یعنی انسان کا جسم اور روح مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے۔ اصل میں یہ اخلاقی اور علم الکلامی شکوک وشبہات کا فلسفہ ہے۔ اس کے بارے میں بہت سی آرا ہیں۔ عیسائیوں کے ہاں یہ نظریہ ہے کہ موت کے بعد نیک روحیں بہتر جگہ پر ہوتی ہیں اور ظالم لوگ بدتر جگہ پر اپنے اپنے فیصلے کا انتظار کرتے ہیں۔ اسی طرح اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ نیک لوگوں کو قبر میں سکون ملتا ہے اور بدی کرنے والے کا عذاب قبر میں پڑتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

نابودیت:

نظم ''نوحہ گر'' میں شاعر نے نابودیت کی اصطلاح تخلیقِ کائنات اور تصورِ موت کے حوالے سے کی ہے۔ جیسے کہ نیستی سے ہستی کا وجود میں آنا اور سائنسی حوالے سے دیکھیں تو ایٹم بم سے ہستی کا نیستی میں بدل جانا۔ مثال ملاحظہ ہو:

نہ ہونے کی بے جسم آغوش میں

بے زمانی کے پہلو بچھے خالی پن میں

جہاں بے جہت لامکاں پر

کوئی لاش راج کرتی تھی

کچھ بھی نہ تھا۔۔

روشنی، تیرگی، سمت، آواز۔۔۔سب نیستی!

بے وجودی کے معدوم سے

''کچھ نہیں'' کی عدم دوش چوٹی سے

بس ایک لمحے کا پھسلاؤ

سمت آشنا غیر مادے سے ٹکراؤ

نقطے کا پھیلاؤ ہونے میں بدلا (۱۸)

نظم میں شاعر نے نوحہ گر کردار اجتماعی انسانی ضمیر کے لیے مختص کیا ہے۔ یہ ایک ایسی صدا ہے جو ضمیر کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے اور سنائی دیتی ہے۔ اس کردار کے ذریعے شاعر نے انسانی تاریخ کی بھیانک تصویر کشی کی ہے۔ شاعر کہتا ہے:

کسی ہاتھ میں نوحہ گر کا قلم ہلا

خون، آدم کی تاریخ لکھتا رہا

ہر ورق پہ لہو جھلملاتا رہا (۱۹)

ان تین مصرعوں میں انسانیت سوز سلوک کی داستان رقم کی گئی ہے۔ یہ شاعر کے مطالعاتی اور مشاہداتی ہنر کا نادر نمونہ ہے۔ نوحہ گر کردار بیک وقت قدیمی بھی ہے اور نوحہ گر بھی ہے۔ ایک برابر تجزیہ کرتا ہے اور دوسرا ماتم۔ یہ ایک علامتی کردار ہے جو قتل و غارت کو پسند نہیں کرتا اور قتل و غارت پر اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے۔

امید و رجائیت:

اس کے ساتھ ہی نظم میں رجائیت کا پہلو نمایاں ہے۔ ماضی کے تلخ واقعات کا بیان کر کے شاعر آئندہ

کے لیے پُر امید ہے۔ اسے ایک روشن مستقبل دکھائی دیتا ہے جو امن وسلامتی کا گہوارہ ہوگا۔ جہاں انسانیت سوز سلوک نہ ہوگا۔ انسان کی قدر ہوگی، عزت ہوگی اور بہتر وسائل میسر ہوں گے۔

شہزاد نیّر اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''امید کا انسان کے داخلی نظام پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر امید کی کوئی کرن نظر آجائے تو مایوسیوں کے دلدل میں دھنسا انسان ایک دم سے زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اس میں زندہ رہنے کی تمنّا پیدا ہو جاتی ہے اور اداسی کی برف پگھل جاتی ہے۔'' (۲۰)

نظم کے آخری حصے میں شاعر کی امید ملاحظہ ہو:

پھر مجھے منتظر بیٹھنا ہوگا
پیچیدہ ہوتی ہوئی اتنی انواع میں
کون جوڑے اقدام ایک اوپر دھرے
سوچنے کا پھر اک بار آغاز ہوا!!! (۲۱)

امن کا پیغام:

بقا کی جنگ وہی جیت سکتا ہے جو قدم بہ قدم ترقی کرے یا دوسروں سے بہتر بننے کے لیے جدّ و جہد جاری رکھے۔ نظم نگار بھی یہی کہہ رہا ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ اگر ایٹمی دور آ گیا تو انسان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ تھوڑی مخلوقات ہی باقی رہیں گی اور پھر از سر نو ارتقائی عمل وقوع پذیر ہوگا۔ شاعر کہتا ہے کہ جنگ و جدل چھوڑ دو۔ یہ نہ ہو کہ سب مٹ جائے اور انسانی تہذیب پھر وہاں سے شروع ہو جہاں سے انسانی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ شعر ملاحظہ ہو:

؎ مجھے علم ہے راکھ ہو جائیں گے
سب زمین و زماں (۲۲)

انسانی ترقی:

شہزاد نیّر کہتے ہیں کہ انسان نے غاروں سے اپنے رہن سہن کا آغاز کیا اور پھر وقت کے پہیے نے انھیں ایسا گردش میں ڈالا کہ وہ غاروں سے پتھر اور پتھر کے دور سے تہذیب یافتہ دنیا میں دوڑتا بھاگتا اور نمود و نمائش کرتا نظر آتا ہے۔ انسان ظاہری نمائش کا دلداہ ہوتا گیا۔ مادی آسائشوں اور مرحوم آرزؤں کی چاہ میں انسان، انسانیت کے رتبے سے گر گیا۔ ان سب پہ نظم کا کردار نوحہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ ان حالات کا عینی شاہد ہے۔ جلیل عالی لکھتے ہیں:

''اس کی تخلیقات میں موجود کسک احساس دلاتی ہے کہ شاعری
اس کی پہلی ترجیح ہے۔ وہ شاعری کرتا نہیں، دل پہ اُتری
شاعری کو کاغذ پہ اتارتا ہے۔'' (۲۳)

شاعر کا کردار نظم میں نوحہ گر کا ہے اور وہ حالات پر نوحہ گری کرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے تن پہ لگے زخموں کو شمار کرتا ہے اور ان زخموں کی چارہ گری کے زمرے میں آوازِ حق کا نوحہ بھی بلند کرتا ہے۔ وہ قتل و غارت کو دیکھ کر بلکتا ہے اور اس کا ضمیر اسے بار ہا ملامت کرتا ہے کیوں کہ وہ امن کا خواہاں ہے۔ شاعر کہتا ہے:

؎ جوشِ گریہ! دباؤ بڑھا!۔۔
اشک سیلاب تھے، بہہ پڑے
سنگ آنکھیں بہاتے ہوئے نوحہ گر بہہ پڑا (۲۴)

خدا کا تصور:

شہزاد نیّر نے نظم میں خدا کے تصور کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ کائنات کی رنگینیاں، اس کی وسعتیں اور خوب صورتیاں ہمیشہ سے انسان کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔ جو بھی اس عظیم کے کائنات کے روبرو کھڑا ہوتا، سہم جاتا۔ یہ ڈرا ڈرا سا انسان جس سے بھی ڈرتا اسے اپنا خدا، یا دیوتا مان لیتا اور پوجنا شروع کر دیتا۔ اسی خوف نے اس کے لیے خدا کو اپنے ذہن میں جنم دیا اور یہیں سے خدا کا تصور نکلا۔ شہزاد نیّر لکھتے ہیں:

یہاں سے وہاں
جس قدر طاقتیں بھی میسر ہوئیں
سب اسے سونپ بیٹھے۔۔تو ڈرنے لگے
ماننا ہو تو وحشت بھری آنکھ کو کوئی پتھر خدا ہے (۲۵)

پتھر کے دور تک کا انسان انتہائی ڈرپوک تھا۔ ایک طرف ڈرپوک تھا تو دوسری طرف بے خوف بھی۔ وہ آسمانی آفتوں سے خوف کھاتا اور دوسری طرف خونخوار جانوروں سے بآسانی نبٹ لیتا۔ یہاں نظم میں شاعر نے ان تبدیلوں کا ذکر کیا ہے جو خدا کے تصور سے منسوب ہیں اور بالآخر جسے انسان اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہا ہے اور یہ سب شاعر کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

شاعر، انسانی تاریخ کے بھیانک دور اور انسان کے بھیانک اور سفّاکانہ روپ کو بے نقاب کرتا ہے۔ جس میں پہلے انسان کا زمین پر قتل، طوفانِ نوح، واقعہ کربلا اور بنی اسرائیل کے قبائل کا ذکر ہے جہاں انسانیت کی تذلیل موجود ہے۔ منظر نگاری دیکھیے:

آسمانوں کی قاتل روانی کا ہتھیار پانی
تنفس کا آزار۔۔۔۔۔۔۔۔پانی

مجھے یاد آتی ہے پانی کی وہ روانی

کہ جس میں سبھی خشک لکڑی بنے (۲۶)

شاعر کے دل میں باطل کے لیے بالکل بھی نرم گوشہ نہیں۔ شاعر نے واقعہ کربلا کو مختلف پیرائیوں میں بیان کیا ہے۔ نوحہ گر، فرقہ واریت قتل و غارت کو دیکھ کر خون کے آنسو روتا ہے اور وہ نوحہ خوانی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ جلیل عالی شہزادنیّر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک اصل تخلیق کار صرف اظہار کو کافی نہیں جانتا۔ فنکارانہ اظہار پر یقین رکھتا ہے۔ یہی دھن شہزادنیّر کا اصل سرمایہ ہے۔ اسے اپنی بات کہنے کا جنون ہے۔ اسی جنون کے سبب اس کے شعری اسلوب کے خدوخال نکھرتے ہیں۔'' (۲۷)

لفظ مشائی خاص ارسطو کی ذات سے منسوب ہے۔ اس کے پڑھانے کا انداز رواقی تھا۔ وہ چلتے پھرتے فلسفہ، فنون اور علوم کی ترسیل کرتا اور ایسے ہی اری زندگی بسر کی۔ ارسطو امن پسند تھا۔ وہ سکندرِاعظم (شہزادہ) کا اتالیق تھا۔ وہ اسے ہمیشہ قتل و غارت سے دور رہنے کی تلقین کرتا۔ لیکن اس کے باوجود سکندرِاعظم نے قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ اشعار میں اس بات کا اظہار ملاحظہ ہو:

وہ جو شہزادگی ورغلاتا رہا

چلتے پھرتے رہے

جا بجا تخمِ حکمت گراتا رہا (۲۷)

اساطیر:

شہزاد نیّر بنی اسرائیل کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی محبوب قوم تھی۔ان پر ظلم وستم ڈھائے گئے۔ بابل کے بادشاہ بخت نصر، یہودیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا۔نوحہ گر، اس پر گریہ وزاوری کرتا ہے۔شاعر تیز گھوڑوں کے پیچھے قیدیوں کو دیکھتا ہے تو بلکتا ہے۔

؎ تند گھوڑوں کے پیچھے بلکتے اسیروں کو سنتا ہوا
ان لاڈلوں کو تڑپتے ہوئے دیکھ کر رو رہا تھا (۲۸)

نظم میں تخلیق کے عمل کے بعد خیالی کردار جو صدا ہے اپنا تعارف کرواتی ہے کہ میں قدیمی ہوں، مجھ سے سنو۔شاعر نے زمین کے اوپری حصے کو انسانی کھال سے تشبیہہ دی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ زمین سے پہلے زندگی کے آثار پانی میں پیدا ہوئے۔وہ لکھتے ہیں:

؎ نامیاتی ازل سے ابد کی طرف جل تھل رینگتے تھے
اگر کوئی لمحہ ڈراتا تو بہہ نکلتے (۲۹)

جب انسانی زندگی شروع ہوئی تو انسان کے پاس علم و ہنر نہیں تھا بلکہ شعور تھا جو اسے ذاتِ خداوندی نے بخشا تھا اور جس کے استعمال سے انسان نے دنیا میں زندہ رہنے کے لیے آسانیاں اور طریقے پیدا کیے۔دنیا میں قدم رکھتے وقت نہ انسان بولنا جانتا تھا اور نہ چلنا۔نہ ہی وہ کسی فن سے واقف تھا۔انسان نے تمام کام ضرورت کے تحت کیے اور سیکھے۔اس نے بولنا سیکھا، شکار کرنا سیکھا اور زندہ رہنے کے لیے اناج اُگانا سیکھا۔پھر اتنا ہوشیار ہو گیا کہ کائنات میں عمل دخل شروع کر دیا۔ڈارون کی تھیوری کے مطابق انسان مسلسل تبدیلی کا نتیجہ ہے۔جیسا انسان ہم آج دیکھتے ہیں یہ ہمیشہ سے ایسا نہ تھا۔بلکہ کئی صدیوں نے اسے تبدیل کیا ہے اور آج کا

انسان بندر کا ارتقائی عمل ہے۔شہزاد نیّر لکھتے ہیں:

؎ پھر ایک بار چھوٹوں نے بستی بسائی
اور ان میں سے دو چار نے
اگلے پیروں کو ہاتھوں میں بدلا
لرزتے ہوئے ایستادہ ہوئے (۳۰)

شاعر بھی انسان کو دیگر حیوانات کی طرح ارتقائی عمل میں کامیابی حاصل کرنے والے جاندار کے طور پر دیکھتا ہے۔ایک ایسا جاندار جس نے اپنے ماحول سے بہتر طور پر مطابقت اختیار کی اور دیگر جانداروں کی دوڑ میں آگے نکل گیا۔جانداروں کی جینز میں ہلکی پھلکی تبدیلیاں ہوتی ہیں اور ان تبدیلیوں کے تسلسل سے ایک نئی نسل پیدا ہوتی ہے جو مختلف بھی ہوتی ہے اور طاقت ور بھی۔وسائل کے حصول کے لیے یہی نسل کامیاب ہوتی ہے اور قائم بھی رہتی ہے۔باقی فنا ہو جاتی ہے۔مثال ملاحظہ ہو:

؎ نجانے ہوا میں، زمین کی گھنی خاک خشکی میں
کیسی کشش تھی کہ بڑھنے لگی
ساحلوں سے پرے ہو کے قامت نکلے
اور اتنے کشیدہ
درختوں پر جھک کر بدن پالتے تھے (۳۱)

انسان پہلے چوپایہ تھا۔جھک کر چلتا تھا۔مٹی کو خدا مانتا تھا۔ابتدا میں انسان غاروں میں رہتا تھا اور اپنی

غذائی ضروریات کو پورا کرنے اس کے لیے بے حد مشکل تھا۔ قدیم انسان جانوروں کو شکار کر کے اس کا کچا گوشت کھاتا تھا۔ انسان ایک سوشل مخلوق ہے۔ زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ اس نے بہت کچھ سیکھا۔ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر رہنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے انسان نے زبان ایجاد کی۔

؎ کنڈ مسکن کیے، آگ چکھی
درونی تپش سے الاؤ جلائے
جہاں جانور رم ہوتے رہے
پھر بھی اندر کوئی بھوک تھی (۳۲)

انسان نے پتھر کو رگڑا اور آگ پیدا ہوئی۔ اس آگ سے قریب پڑی گھاس جل گئی۔ اس واقعے کے گہرے مشاہدے نے آگ کی ایجاد کی طرف انسان کی رہنمائی کی۔ ابتدائی انسان نے بیج کو گیہوں، چاول، جو وغیرہ کو زرخیز مقامات پر پیدا ہوتے دیکھا۔ ایک عرصہ تک انسان بیج کھاتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس بیج سے انسان نے فصل اگانا سیکھا۔ شہزاد نیّر لکھتے ہیں:

؎ پھر گھنے جنگل کی تیرگی سے پرے
جاننے کا نیا پھل چکھ آنکھ پردہ ہٹا (۳۳)

انسان نے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیا۔ نوحہ گر کہتا ہے کہ چوپایہ سے دو پایہ والا انسان اتنا ایڈوانس ہو گیا کہ خلا میں جا کر میزائل پھینکنے لگا۔ پھر فطرت ظالم ہوتی گئی اور ہمارا بس نہ چلا۔ اب انسان نے فطرت پر فتح

حاصل کر لی ہے اور اپنے لیے آسائشیں پیدا کر لی ہیں۔شعری مثال دیکھیے :

؎میری سوچوں تلے آ گئے
وہ جو قاتل جراثیم تیری خدائی میں
تہذیبیں کھاتے رہے (۳۴)

ہستی کا عدم سے وجود میں آنا اور اس کا لگا تار پھیلتے جانا وجودیت کہلاتا ہے۔خالد اقبال وجودیت کی تعریف لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''وجودیت انسان کی فطری تخیل کی رفعت کا ادراک نہیں رکھتی
اور صرف و صرف اس کی تباہی و بربادی کی داستان سناتی
ہے۔'' (۳۵)

اس تصور میں انسان ، انسانی اہمیت ، اس کے وجود، نظریات اور تصورات کے حوالے سے بحث ملتی ہے۔ یہ بحث ہمیشہ سے ہے کہ یہ کائنات انسان کے لیے بنائی گئی یا انسان کو اس کائنات کے لیے تخلیق کیا گیا۔

؎لا وجودی چٹانوں کے پھیلے ہوئے کالے پن میں
زمان و مکان سے لتھڑے ہوئے
آسمان، کہکشائیں، زمینیں
توانائی، مادے کی تجسیم میں
دیکھتا تھا نہونے سے ہونا (۳۶)

رنج والم:

دکھ درد انسانی زندگی کا لازمی جزو ہے۔غموں کی بدولت انسان زندگی کی حقیقتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ ہر انسان کو زندگی میں غموں کا سایہ ملتا ہے۔شاعر کے لیے تو غم ہی زندگی کی میراث ہوتا ہے۔غم کی کیفیت کے متعلق شہزادنیّر لکھتے ہیں:

''غم خوشی سے زیادہ پائیدار ہوتا ہے کیوں کہ غم دائمی ہوتا ہے، انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتا،غم کے لمحات گزر جانے کے بعد بھی اثرات چھوڑ جاتے ہیں اور ایک یاد بن کر باقی رہ جاتے ہیں۔ اس کیفیت سے انسان میں طاقت پیدا ہوتی ہے جس سے اس کا غرور ٹوٹ جاتا ہے۔غم عاجزی پیدا کرتا ہے اور اس سے دوسروں کے لیے احساس پیدا ہوتا ہے جب کہ غم کی نسبت خوشی عارضی ہوتی ہے۔ کچھ پل کے لیے آتی ہے اور پھر ختم ہو جاتی ہے۔'' (۳۷)

شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم میں غم کی شدت نظر آتی ہے۔غم کے فلسفے کو شہزادنیّر یوں بیان کرتے ہیں:

؎ شوخ قوس تبسّم میں پلتے ہوئے
بے بصر زندگی کے طرب زا خیالو!
تعیش کے امروز میں سانس لیتی ہواؤ!
ذرا ہٹ کے بیٹھو (۳۸)

شعری ایمائیت:

نظم میں بعض مقامات پر انسانی تہذیب کی انتہائی اہم کروٹوں کو اختصار اور شعری ایمائیت کے ساتھ جزوِ نظم بنایا گیا ہے۔ بالخصوص ستر پوشی، جنسی جبلّت اور تخیل کے اوّلیں احساسات کو محض دو دو مصرعوں میں سمیٹا گیا ہے۔ یہ شاعر کی ہنرمندی پر ناقابلِ تردید دلالت ہے۔

پوری نظم میں شاعر ایک کردار کے طور پر موجود دکھائی دیتا ہے۔ جس کی آنکھ جگہ جگہ انسانی غم سے نم ہو جاتی ہے مگر شاعر کی شخصیت میں متشکک کی موجودگی اس کے اظہار پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کا جبر، تاریخی جبر کے تناظر میں دستیاب علوم کی وساطت سے تجزیہ کرتی چلی جاتی ہے اور اس سبب تک رسائی حاصل کرتی ہے جو اس جبر کا منبع ہے۔ اس ماخذ کو نظم ''خدا'' کے روپ میں پیش کرتی ہے۔

یہ نظم خدا کو ایک ایسا لفظ قرار دیتی ہے جس کے گرد پہلے انسان خود عقیدے اور عقیدت کا ہالہ بناتا ہے اور پھر اس عقیدے اور عقیدت کی آڑ میں زر اور زمین کی ہوس میں انسانی بقا کے ساتھ جابرانہ اور سفّاکانہ کھیل کھیلتا ہے جسے تاریخ اپنی تمام کوششوں کے باوجود دبانے اور چھپانے میں ناکام نظر آتی ہے۔ یہ کردار بیک وقت قدیمی بھی ہے نوحہ گر بھی۔ اس کی ایک حیثیت ناظر کی ہے اور ایک حیثیت شاعر کی۔ ایک برابر تجزیے میں مشغول ہے اور دوسرا برابر ماتم کرتا نظر آتا ہے۔ اس دوہری کیفیت نے نظم کا تار پور تشکیل دیا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں اس نظم کا فکری مواد شعری قالب میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ نظم لاموجود سے موجود کی طرف اور قنوطیت سے رجائیت کی طرف سفر کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ نظم میں رجائیت کی اساس سراسر ''علم'' کو قرار دیا گیا ہے۔ جس میں اس کی ابدی مسرت اور ازلی مسائل کا حل پوشیدہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔سجاد باقر رضوی۔مغرب کے تنقیدی اصول۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۳ء۔ص۲۱۳

۲۔نسیم عبدالمجید۔طویل نظم کے رجحانات۔لاہور: بیکن بکس،۲۰۱۶ء۔ص۳

۳۔انور سدید، ڈاکٹر۔اردو ادب کی تحریکیں۔کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۷ء۔ص۵۱۸

۴۔رشید امجد، ڈاکٹر۔پاکستان کی نئی نظم پر گفتگو۔راولپنڈی: ایس ٹی پرنٹرز،۱۹۸۱ء۔ص۳۴۷

۵۔ایضاً

۶۔شمس الرحمان فاروقی۔طویل نظم اور مختصر نظم،مشمولہ ''اوراق''۔لاہور،جلد۱۹،شمارہ نمبر۳،۴،۱۹۸۴ء۔ص۱۰

۷۔یوسف حسن۔اردو نظم کے پچاس سال۔لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی،۲۰۱۵ء۔ص۹۳،۹۴

۸۔ شہزاد نیّر۔گرہ کھلنے تک۔لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء۔ص۱۱۹

۹۔ایضاً

۱۰۔ایضاً۔ص۱۴۱

۱۱۔محمود علی سڈنی۔فلسفہ،سائنس اور کائنات۔لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب،۱۹۹۵ء۔ص۶۳

۱۲۔شہزاد نیّر۔گرہ کھلنے تک۔ص۱۳۳،۱۳۴

۱۳۔ایضاً۔ص۱۳۶

۱۴۔ایضاً۔ص۱۴۱

۱۵۔ایضاً۔ص۱۳۷

۱۶۔ایضاً

۱۷۔ایضاً۔ص۱۴۱

۱۸۔ایضاً۔ص۱۱۹

۱۹۔ایضاً۔۱۴۰

۲۰۔راقمہ کا شہزاد نیّر سے ٹیلی فونک انٹرویو، بتاریخ ۲۵۔اکتوبر،۲۰۲۱ء۔وقت: چار بجے شام

۲۱۔شہزاد نیّر۔گرہ کھلنے تک۔ص۱۴۰

۲۲۔ایضاً۔ص۱۳۹

۲۳۔جلیل عالی۔''گرہ کھلنے تک'' کی فکری وشعری دُھن،مشمولہ ادبِ لطیف (ماہنامہ)۔شمارہ ۷ جولائی ،

۲۰۱۵ء۔ص۸۷

۲۴۔شہزاد نیّر۔گرہ کھلنے تک۔ص۱۲۹

۲۵۔ایضاً۔ص۱۲۵

۲۶۔ایضاً۔ص۱۴۴

۲۷۔ایضاً۔۱۳۰

۲۸۔جلیل عالی۔''گرہ کھلنے تک'' کی فکری وشعری دُھن،مشمولہ ادبِ لطیف (ماہنامہ)۔شمارہ ۷ جولائی ،

۲۰۱۵ء۔ص۸۸

۲۹۔شہزاد نیّر۔گرہ کھلنے تک۔ص۱۳۰،۱۳۱

۳۰۔ایضاً۔ص۱۳۲

۳۱۔ایضاً۔۱۲۴

۳۲۔ایضاً

۳۳۔ایضاً

۳۴۔ایضاً۔ص۱۲۵

۳۵۔ایضاً۔ص۱۲۶

۳۶۔ایضاً۔ص۱۳۹

۳۷۔خالد اقبال یاسر۔جدید تحریکات اور اقبال۔لاہور: حاجی حنیف پریس،۲۰۱۵ء۔ص۲۲۹

۳۸۔شہزاد نیّر۔گرہ کھلنے تک۔ص۱۲۰

شہزاد نیّر کی نظموں ''خاک'' اور ''نوحہ گر'' کا تقابلی جائزہ

نظم ''خاک'' ایک خاکی وجود کی بقا کی داستان ہے اور ساتھ ہی ساتھ امنِ عالم کا درس دیتی ہے۔ نظم میں کئی پہلو بیان ہوئے ہیں۔ شہزاد نیّر کی نظم ''خاک'' موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ایک معیاری طویل نظم ہے۔ یہ نظم امیجری کی عمدہ مثال ہے اور تاریخی اور عصری شعور کی آئینہ دار ہے۔ شہزاد نیّر انسانی جذبات کا گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس نظم میں مرکزی فوجی کی زبان سے خاک کی بھیک مانگی ہے کہ اسے مٹی کی چادر اور اپنی دھرتی کی آغوش میسر آجائے۔ خاک کا خاک سے دوبارہ جڑنے کا عمل ہی اس نظم کا نقطہ عروج ہے۔ دوسری طرف ''نوحہ گر'' شہزاد نیّر کی دوسری طویل ترین نظم ہے۔ یہ امنِ عالم کا پیام سناتی ہے۔ شاعر کا کردار نظم میں نوحہ گر کا ہے اور وہ حالات پر نوحہ گری کرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے تن پہ لگے زخموں کو شمار کرتا ہے اور ان زخموں کی چارہ گری کے زمرے میں آوازِ حق کا نوحہ بھی بلند کرتا ہے۔ وہ قتل و غارت کو دیکھ کر بلکتا ہے اور اس کا ضمیر اسے بار ہا ملامت کرتا ہے کیوں کہ وہ امن کا خواہاں ہے۔

نظم ''خاک'' میں مذہبی سادہ لوحی کا بیان ملتا ہے۔ انسان کو رہنے کے لیے گھر کی ضرورت ہے اور اسے گھر میسر نہیں۔ کچھ لوگ بے گھر ہیں اور کچھ شکستہ گھروں میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ وہ ذاتِ بابرکت، جسے کسی گھر کی ضرورت نہیں، لوگوں کو اس کا گھر یعنی مسجد خوب صورت اور پکی بنانے کا احساس تو ہے لیکن بے گھروں کو چھت دینا ان کے بس میں نہیں نہ اس کا احساس ہے۔ یہاں شہزاد نیّر کے کہنے کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی حقوق نہیں۔ کچھ لوگ بے گھر ہیں اور کچھ شکستہ گھروں میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ وہ ذاتِ بابرکت، جسے کسی گھر کی ضرورت نہیں، لوگوں کو اس کا گھر یعنی مسجد خوب صورت اور پکی بنانے کا احساس تو ہے لیکن بے گھروں کو چھت دینا ان کے بس میں نہیں نہ اس کا احساس ہے۔ یہاں شہزاد نیّر کے کہنے کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی حقوق العباد پر زور دیتا ہے لہٰذا انسان کو انسانیت کی بھلائی پہلے دیکھنی چاہیے۔ مذہبی سادہ لوحی کی ایک اور مثال دیکھیے:

؎ بنی انسان میں تقسیم ہوئی زندگی

زر سے کشیدہ عظمتیں
سکوں کی آتش سے ٹپکتے تن
بدن کی اوٹ میں پلتی محبت
ٹوٹتی قدریں
سمٹتے فاصلوں میں چھپ کے
بڑھتے فاصلوں میں
اک خدا کے نام پر تقسیم ہوتے لوگ

مندرجہ بالا مصرعوں میں خدا کا تصور بھی پیش کیا گیا ہے اور انسانیت کی زبوں حالی بھی۔ ''نوحہ گر'' میں بھی یہ موضوع موجود ہے۔ نظم ''نوحہ گر'' خدا کو ایک ایسا لفظ قرار دیتی ہے جس کے گرد پہلے انسان خود عقیدے اور عقیدت کا ہالہ بناتا ہے اور پھر اس عقیدے اور عقیدت کی آڑ میں زر اور زمین کی ہوس میں انسانی بقا کے ساتھ جابرانہ اور سفّاکانہ کھیل کھیلتا ہے جسے تاریخ اپنی تمام کوششوں کے باوجود دبانے اور چھپانے میں ناکام نظر آتی ہے۔ یہ کردار بیک وقت قدیمی بھی ہے نوحہ گر بھی۔ اس کی ایک حیثیت ناظر کی ہے اور ایک حیثیت شاعر کی۔ ایک برابر تجزیے میں مشغول ہے اور دوسرا برابر ماتم کرتا نظر آتا ہے۔ اس دوہری کیفیت نے نظم کا تار پور تشکیل دیا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں اس نظم کا فکری مواد شعری قالب میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ نظم لاموجود سے موجود کی طرف اور قنوطیت سے رجائیت کی طرف سفر کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ نظم میں رجائیت کی اساس سراسر ''علم'' کو قرار دیا گیا ہے۔ جس میں اس کی ابدی مسرت اور ازلی مسائل کا حل پوشیدہ ہے۔

باب چہارم

شہزاد نیّر کی شاعری پر ایک نظر

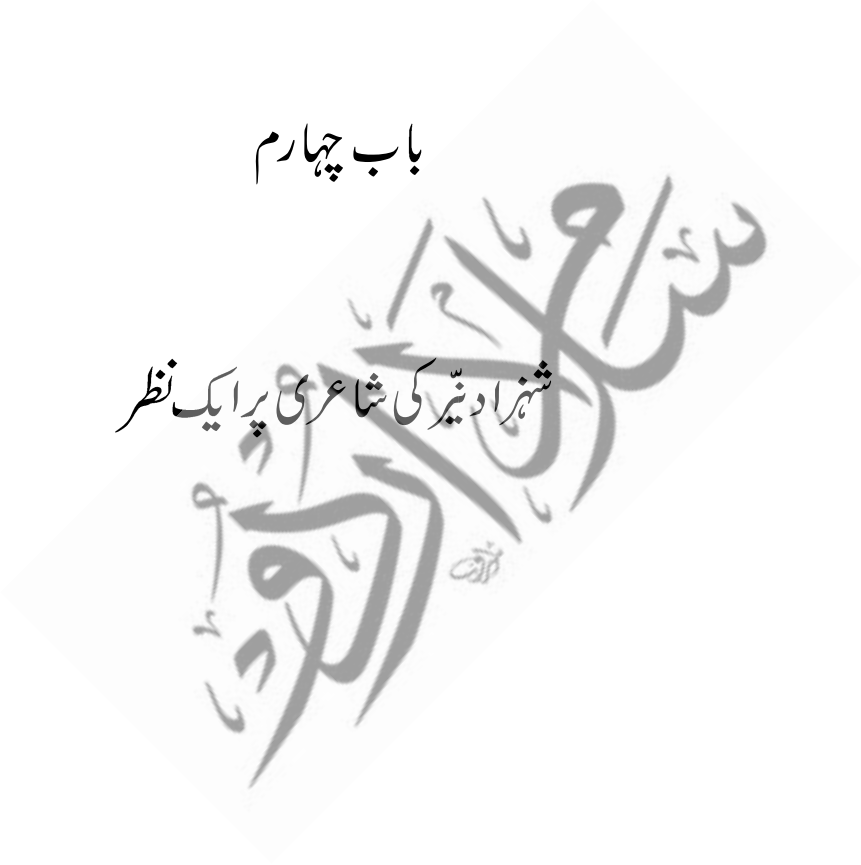

باب چہارم

شہزاد نیّر کی شاعری پر ایک نظر

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ شاعر یا ادیب، موضوعات اپنے گرد و پیش سے چنتا ہے اور انھیں اپنی تخلیقات کا حصہ بناتا ہے۔ مختصر یہ کہ شاعر یا ادیب کی تخلیقات کا تعلق زمینی حقائق سے ہوتا ہے۔ لکھاری معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسے صفحۂ قرطاس پر اتارتا ہے۔ ہر لکھنے والے کا یک اسلوب ہوتا ہے جو اسے ممتاز بناتا ہے۔ کچھ شعرا اور ادیب رومانی انداز میں لکھتے ہیں۔ کچھ کی نثر شاعرانہ ہوتی ہے۔ کچھ کا انداز منطقی اور استدلالی ہوتا ہے۔ کچھ شعرا اور ادیب حقیقت پسند ہوتے ہیں اور ان کی نثر کسی بھی قسم کی رومانیت، تعصب اور موضوعیت سے پاک ہوتی ہے۔ ایسے لکھنے والے دیانت داری سے حقائق کو پیش کرتے ہیں۔ ایسے ہی شعرا میں شہزاد نیّر کا شمار بھی ہوتا ہے۔

حقیقت پسندی:

شہزاد نیّر نے اپنی نظم ''اعترافیہ'' میں حقیقت پسندی کے حوالے سے بہت عمدہ اظہار کیا ہے۔ اس نظم میں ہمیں موجودہ حالات کا نوحہ نظر آتا ہے۔ اس میں ہمیں داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ خارجی حقیقت پسندی کا عنصر بھی ملتا ہے۔ نمونے کے لیے اشعار ملاحظہ ہوں:

ہمارا دیکھنا کیا ہے
نظر ٹکنے نہیں پاتی
کہ ہر منظر بدلتا ہے
اگر منظر ٹھہر جائے تو آنکھیں وہ نہیں رہتیں
نگاہیں ریت ہیں
آنکھوں کی مٹھی سے پھسلتی ہیں (۱)

اگلا بند دیکھیے :

ہمیں دیکھو
قدیمی فلسفوں کے دشت میں خود سے بچھڑ کر
واہموں میں ڈھونڈتے
ہر دم بھٹکتے ہیں
دماغ اِک میز پر رکھا ہے
آنکھیں فائلوں کے ڈھیر میں گم ہیں
جہاں ۔۔۔۔ پوروں میں سمٹے ہیں
مگر ہم بٹ رہے ہیں (۲)

کہنے کو تو شہزاد نیّر نے اپنی نظم ''اعترافیہ'' کو کتاب ''برفاب'' کے انتساب کے طور پر جگہ دی ہے مگر حقیقیت پسندی کی نظر سے دیکھا جائے تو اس کی فکری نوعیت ایک ناول کی طرح ہے۔ جس طرح ناول کلی طور پر معاشرے یا ماحول کے تمام موضوعات کو کرداروں کے ذریعے بے نقاب کر کے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے ٹھیک اسی طرح ''اعترافیہ'' میں بھی شہزاد نیّر نے اپنے ماحول، لوگوں کے نظریات، رہن سہن اور مصروفیات کو بہت عمدہ اور اعلیٰ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ نظم اپنے اندر حقیقت پسندانہ انداز کے ساتھ گہری فکر اور معنویت لی ہوئے ہے۔ اشعار دیکھیے :

حقیقت اس قدر ہے

درحقیقت کچھ نہیں

باقی فسانہ ہے

فسانہ جو کسی پر

مجھے لکھنا نہیں آتا (۳)

شہزاد نیّر نے نہ لکھنے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ماحول پر سب کچھ لکھ ڈالا اور لکھا بھی ایسا کہ پڑھتے ہوئے پورا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔

اس نظم میں شہزاد نیّر نے حقیقت پسندی کا اظہار کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یوں تو ہم دن بہ دن ترقی کر رہے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم دن بہ دن روحانی طور پر پستی کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہماری زمینی روایتیں فوت ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارا فن دم توڑ رہا ہے اور انسانی اقدار مٹی میں ملتی جا رہی ہیں۔ اللہ پاک نے انسان کو برابری کی حیثیت عطا کی لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ انسان خدا کے نام پر ہی لوگوں کو تقسیم کر رہا ہے۔ جا بجا فرقہ واریت ہے۔ لوگ اپنے آپ کو ہندو، عیسائی، مسلمان، یہودی اور مزید نا جانے کن ناموں سے گنوانے میں مصروف ہیں۔ اس موضوع پر اعترافیہ کے مصرعے دیکھیے:

سمٹتے فاصلوں میں

چھپ کے بڑھتے فاصلوں میں

اک خدا کے نام پر تقسیم ہوتے لوگ (۴)

شہزاد نیّر نے کئی نظموں میں معاشرتی حقائق کو قلم بند کیا ہے۔ ''ہائبرنیشن'' سے ایک بند ملاحظہ ہو:

میں صدیوں سے تنہا

گھٹن میں گندھے، حبس و تاریک میں سانس روکے پڑا ہوں

بدن کے غلیظ اور سیلن زدہ بل میں بے حس و حرکت

نم آلودہ مٹی میں لتھڑا ہوا ہوں

نہ جانے میں زندہ ہوں (۵)

مندرجہ بالا پیرائے میں زندہ رہنے کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے جس میں اکثر کوئی جان دار گھرا دکھائی دیتا ہے۔ خدائی آفتوں مثلاً برف باری وغیرہ میں جان دار اپنے آپ کو کسی تنگ و تاریک جگہ کے حوالے کر دیتا ہے اور ایسے میں زندہ رہنے کا احساس ہی اسے زندہ کیے رکھتا ہے۔ شہزاد نیّر نے ایک جان دار کے احساس کو محسوس کرتے ہوئے اس کمال مہارت سے اس کا بیان کیا ہے کہ قاری تعریف کیے بنا نہیں رہ سکتا۔

داخلیت و خارجیت:

شاعر کے لیے خارجیت کا مظاہرہ انتہائی مشکل کام ہے۔ لیکن شہزاد نیّر کو داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت کو بیان کرنے پر بھی قدرت حاصل ہے۔ وہ اپنی ذات سے کلی طور پر نکل کر پورے معاشرے میں منقلب ہوتے نظر آتے ہیں اور یہی ایک اعلیٰ شاعر اور شاعری کی خصوصیت ہے۔ نظم ''کبھی سورج بھی نکلے گا'' کے اشعار مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں:

ابھی سورج نہیں نکلا

سڑک پر گاڑیوں کے قافلے آئے نہیں

لیکن دہاڑی دار مزدوروں کا اک میل بدن مایہ

اڈکر چوک میں آیا

بدن پر میل میں لپٹی ہزاروں سلوٹیں پہنے

پھٹے پیروں میں ٹھنڈی خاک کے جوتے۔۔ (۶)

مندرجہ بالا مصرعوں میں شہزاد نیّر نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزدور کی زندگی کے بارے میں یہ بیان کرنے ک کوشش کی ہے کہ صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے مزدور اپنے میلے کچیلے لباس میں چوک پر پہنچ کر کام کی تلاش میں بھٹکتے ہیں۔اس نظم میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا گیا بلکہ اس ماحول اور مزدور کی کیفیات کو پرکھتے ہوئے سادہ الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

تنقیدِ حیات:

ادب معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ادب اور معاشرے کا گہرا تعلق ہے۔ادب کو اسی سبب تنقیدِ حیات کہا گیا ہے۔ادب انسانی زندگی کے تہذیبی اور مذہبی عوامل کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لیے ادب کو معاشرے کی اصلاح کرنے والا ہونا چاہیے۔اس کے لیے ضروری ادیب اپنے آپ کو اس مکتبہ فکر کے تابع رکھیں تا کہ ادب سے معاشرے کی اصلاح کا کام لیا جا سکے۔اس حوالے سے اگر شہزاد نیّر کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو ان کے کلام میں معاشرتی اور مذہبی زندگی کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ ملتا ہے۔نمونے کے طور پر نظم ''بے نیازِ مکاں'' ملاحظہ ہو جس میں مذہبی سادہ لوحی دیکھی جا سکتی ہے:

اندھیرا سرکتا تھا

مٹی کے ملبوس والے گھروں

لڑکھڑاہٹ میں اک دوسرے سے الجھتی ہوئی

ٹیڑھی گلیوں میں بہتا ہوا

ہاتھ کھڈی کے موٹے کواڑوں سے چھنتے ہوئے

کچے کمرے کی مٹی گراتی

چھتوں سے ٹپکتی ہوئی باس میں گھل گیا

خشک پتوں کی کڑیوں سے رستا اندھیرا

ٹھہرتا نہیں تھا کہ سورج پھسلتا تھا (۷)

مذکورہ مصرعوں میں شہزاد نیّر نے طنزیہ انداز اپناتے ہوئے ایک ایسی بستی کی منظر کی ہے جہاں غربت و افلاس جھلکتا ہے۔ در و دیوار خستگی کی علامت بنے ہوئے ہیں۔ سورج کی کرنیں کمزور چھتوں کو پار کر کے آنکھوں کو چندھیا رہی ہیں۔ کمرے بھی کچے اور بوسیدہ ہیں۔ لیکن بستی والوں نے اس بوسیدگی کے باوجود خدا کے گھر کو پختہ اور خوب صورت بنایا ہے۔ اشعار دیکھیے :

؎ غربت، عقیدت سے لبریز بستی

اندھیرے میں گھرتی تھی

لیکن دمکتے ہوئے

رنگ و روغن کی پوشاک پہنے

چمک دار معبد کے اونچے

منارے پر کرنوں کا میلا تھا

کچے گھروندوں کی دیواروں نے

اپنے حصے کی کرنیں ملا کر

خدا کی رہائش کی خاطر

اُسار ی گئی پختگی پر الٹ دی تھیں

پکے منارے سے کچی سماعت میں آواز اُتری

خدا لامکاں ہے!!! (۸)

نظم میں مذہبی سادہ لوحی کا بیان ملتا ہے۔ انسان کو رہنے کے لیے گھر کی ضرورت ہے اور اسے گھر میسر نہیں۔ کچھ لوگ بے گھر ہیں اور کچھ شکستہ گھروں میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ وہ ذاتِ بابرکت، جسے کسی گھر کی ضرورت نہیں، لوگوں کو اس کا گھر یعنی مسجد خوب صورت اور پکی بنانے کا احساس تو ہے لیکن بے گھروں کو چھت دینا ان کے بس میں نہیں نہ اس کا احساس ہے۔ یہاں شہزاد نیّر کے کہنے کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی حقوق العباد پر زور دیتا ہے لہٰذا انسان کو انسانیت کی بھلائی پہلے دیکھنی چاہیے۔ مذہبی سادہ لوحی کی ایک اور مثال دیکھیے :

بنی انسان میں تقسیم ہوئی زندگی
زر سے کشیدہ عظمتیں
سکوں کی آتش سے ٹپکتے تن
بدن کی اوٹ میں پلتی محبت
ٹوٹتی قدریں
سمٹتے فاصلوں میں چھپ کے
بڑھتے فاصلوں میں
اک خدا کے نام پر تقسیم ہوتے لوگ (۹)

ان مصرعوں میں شہزاد نیّر نے مذہبی حوالے سے اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ موجودہ دور کا انسان خدا کے نام پر تقسیم ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ کوئی عیسائی ہے تو کوئی ہندو۔ کوئی یہودی ہے تو کوئی مسلمان۔ کسی کا مذہب انسانیت نہیں۔ سب فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور فرقہ واریت کو فروغ دے رہے ہیں۔

موجودہ دور کی عکاسی:

شہزاد نیّر کی کئی نظمیں موجودہ دور کی عکاہیں۔ان کی نظموں میں حالات کے بدلتے رنگوں کے ساتھ ساتھ جدیدیت اور سائنسی پس منظر کا عمدہ انداز میں ذکر ملتا ہے۔وہ اس بارے میں انتہائی گہرے اور عمیق مشاہدے کے مالک نظر آتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

انگلیوں کے تلے

ایک دنیا قطاروں میں آباد ہے

نرم جنبش سے جونہی کلیدیں دبیں

رنگ اور نور کی تازہ ترتیب تھی!

لفظ پوروں سے ہر دم ٹپکتے ہوئے

عکسِ رنگیں نگاہوں میں گھلتا ہوا

وقت اُڑتا ہوا۔۔۔ (۱۰)

مندرجہ بالا مصرعوں میں شہزاد نیّر جدیدیت اور سائنسی ایجادات کو موضوع بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کی سائنسی ایجادات کی بدولت دنیا گلوبل ولیج بن گئی ہے۔انسان کے ہاتھ میں پوری دنیا قید ہے۔موبائل فون اس دور کی سب سے بڑی ایجاد ہے جس سے رابطوں میں آسانی آ گئی ہے چاہے کوئی کتنا ہی دور کیوں نہ ہو۔ اس ایجاد سے پہلے لوگوں کو رابطے میں دشواری کا سامنا رہتا تھا لیکن آج اس چھوٹے سے آلے کے سبب تمام منظر بدل کر رہ گیا ہے۔شہزاد نظموں کی کئی نظموں میں جدیدیت اور سائنسی حوالوں سے ازارے ملتے ہیں۔شہزاد نیّر دورِ جدید کی ایجادات کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی نظم ''Cyber Chat'' میں لکھتے ہیں:

دوریاں انگلیوں پر لپٹتی رہیں

ایک پردے پہ دنیا سمٹتی رہی

وقت اڑتا رہا

اجنبی دور دیسوں کے لوگوں

کی سنگت میں کٹتا رہا

انگلیوں کی زبانی وہ اظہار اب

کتنا آسان ہے

لب سے کہنے میں جس کو زمانے لگیں (۱۱)

شہزاد نیّر اس بات کا اعتراف برملا طور پر کرتے ہیں کہ سائنسی تجربات کے ذریعے سے دوریاں انگلیوں پر لپٹ کر رہ گئی ہیں اور پوری دنیا ایک پردے پر یعنی موبائل سکرین پر سمٹ سی گئی ہے۔ شہزاد نیّر جہاں موبائل کی افادیت کی بات کرتے ہیں وہیں سائنس کی بدولت ہونے والی تباہ کاریوں کو بھی موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ مثال دیکھیے:

روز بڑھتا علم

گھٹتا امن

زخمی ضابطے

بنتے بکھرتے نظریے

مرتی روایت

آخری سانسوں پہ آئے فن

گھسٹتی زندگی

اڑتی اجل

پھٹتے ہوئے جوہر

سلگتی سوچ میں تپتے سوالوں کا دھواں ہے (۱۲)

یہاں بھی شہزاد نیّر نے سائنس کے ذریعے ہونے والے نقصانات کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ روز بہ روز ترقی تو ہو رہی ہے لیکن امن گھٹ رہا ہے۔ روایت اور تہذیب مرتی چلی جا رہی ہے۔ ثقافت کا نام و نشان مٹ رہا ہے۔ فن دم توڑ رہا ہے اور فن کار کی اب کوئی اہمیت نہیں۔ سائنسی علوم کے استعمال سے ہم نے جوہری توانائی کو حاصل تو کر لیا ہے لیکن اس سے اٹھنے والا دھواں ہماری سوچ اور خیال کو مفلوج کر رہا ہے۔

جدید ٹیکنالوجی اور جدیدیت کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنی نظم ''ایک کال کی دوری پر'' میں یوں لکھتے ہیں:

فضا سے تیز رابطوں کی بارش برس پڑیں

زمیں پہ جال تن گئے

بس ایک دھار ہاتھ پر پڑی رہے

جہاں بستگی رہے (۱۳)

مندرجہ بالا مصرعوں میں شہزاد نیّر بے جدید ٹیکنالوجی کی بات کی ہے کہ سائنسی ایجادات نے پوری دنیا کو صرف ایک کال کی دوری پر باندھ رکھا ہے۔ جب سے انسان کے ہاتھ میں موبائل جیسا آلہ آیا ہے، انسان نے فضا کو رابطوں کی بارش سے جکڑ لیا ہے اور پوری زمین پر ایک قسم کا جال بچھا دیا ہے۔ یہ دراصل نیٹ ورک کا جال ہے۔ جس کے اندر وہ اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا ہے اور روز بہ روز روابط اور مراسم مضبوط کرتے دکھائی دے

رہا ہے۔شہزاد نیّر کی نظم علامتی پیرائے لیے ہوئے ہے اور انھوں نے علامتی انداز اپناتے ہوئے دورِ جدید کا ذکر کیا ہے۔ایک اور نظم دیکھیے :

جہانِ گوش وید کی حدود ختم ہوگئیں

کس کی گوش گاہ کا عدد جو ہاتھ آ گیا

وہ دست رس میں آ گیا

بس اک کلید مس ہوئی

تمام قفل کھل گئے

بس ایک نقش مخفی

ہزار لفظ ڈھل گئے (۱۴)

شہزاد نیّر سائنسی افادیت اور جدیدیت کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہلے زمانے میں لوگ ایک دوسرے سے ملاقاتیں کرنے اور روبہ رو ملنے کی جستجو کرتے تھے مگر آج کل تو کسی کے گوش گاہ کا عدد یعنی موبائل نمبر ہو تو اگلا شخص آپ کی دسترس میں ہوتا ہے۔ایک شخص کا دوسرے شخص سے اظہارِ خیال کرنا صرف ایک کلید مس کرنے میں مخفی ہے۔کلید کے مس کرنے کے بعد سارے قفل کھل جاتے ہیں۔اس کے بعد تو لفظوں کے سمندر رواں ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

''برفاب'' میں شامل نظم ''ہائبرنیشن کی بات کی جائے تو اس میں بھی سائنسی رنگ غالب ہے۔کہنے کو تو ہائبرنیشن ایک سائنسی موضوع ہے مگر شہزاد نیّر کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے اس سائنسی موضوع کو عام دنیا سے منسلک کیا ہے۔مثال دیکھیے :

؎ بدن کے اسی غار میں نیم مردہ

مری ذات ہے

لمبے عرصے کی قیدی

بدن میں جونہی سانس رکنے لگے تو

سسکتے سسکتے ان آنکھوں کے روزن تک آتا ہوں

اور ڈرتی ڈرتی نگاہوں سے

چوگرد پھیلا سماں دیکھتا ہوں

نہیں۔۔۔بل کے باہر کا موسم

ابھی سازگاری پہ مائل نہیں (۱۵)

انسانی نفسیات سے آگاہی:

شہزاد نیّر کا ایسے سائنسی موضوع کو عام زندگی سے منسلک کرنا ان کی فکر اور فن کی دلیل ہے۔ نہ صرف اس نظم میں بلکہ کئی نظموں میں انھوں نے ایسے تجربے کیے ہیں۔ ''پتھروں کے درمیاں'' کے چند مصرعے دیکھیے:

؎ میرے چوگرد مٹتے ہوئے لوگ ہیں

برقی تاروں کا جال ان کو جکڑے ہوئے

ہاتھ میکانکی، چال روبوٹ سی

روز شب خود کو ''ای میل'' کرتے ہوئے (۱۶)

مندرجہ بالا مصرعوں میں جدیدیت کی بہترین مثال ملتی ہے۔ شہزاد نیّر کہتے ہیں کہ:

''شاعری جب تک نئے مظاہر کو نئی زبان میں بیان نہیں کرے
گی ، وہ اس عہد کے انسان کی حقیقی زندگی سے دور رہے
گی۔''(۱۷)

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ انسان کے ذہن اور فہم کے ساتھ نفسیات کا گہرا تعلق ہے ۔ نفسیات جہاں انسان کے انفرادی افعال و اعمال کا تجزیہ کرتی ہے وہاں یہ انسانی معاشرتوں کی اجتماعی نفسیات پر روشنی بھی ڈالتی ہے ۔ جب سے انسان موجود ہے، اسی وقت سے نفسیات بھی موجود ہے ۔ کولرج نے کہا تھا کہ عظیم شاعر کو فلسفی ، غیر ذاتی مشاہدہ ، باشعور اور انسانی نفسیات سے آشنا ہونا چاہیے ۔ شاعر شعوری اور لاشعوری ، دونوں قوّتوں سے کام لیتا ہے اور ایک اچھا شاعر احساسات کا پاس دار ہوتا ہے ۔ دیکھا جائے تو یہ تمام خصوصیات ہمیں شہزاد نیّر کے ہاں دکھائی دیتی ہیں ۔ ان کے ہاں ہمیں شعری دیانت کا بہترین تجربہ نظر آتا ہے ۔ وہ اپنی شاعرانہ ذہانت کی بدولت انسانی زندگی اور اس کی مختلف نفسیاتی کیفیات کا گہرا مطالعہ کرتے قلبِ انسانی کی گہرائیوں تک پہنچنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں ۔ آدمی کو پڑھنا اور اس کی پہچان کرنا شہزاد نیّر کا محبوب مشغلہ ہے ۔ انھوں نے اپنی زندگی کے عمیق مشاہدے کے سبب شاعری میں انسانی نفسیات کے کامیاب تجزیے پیش کیے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

فلک پر کوئی
کوندا سا لپکتا ہے
لکیری روشنی آنکھوں میں بھرتی ہے
میں حیراں پوچھتا ہوں
کون ہے؟
کوئی نہیں ! (۱۸)

مندرجہ بالا مصرعوں میں انسانی کیفیات کو بہت عمدہ انداز میں پیش کیا گیا اور اس میں انسان کی اس کیفیت کا بیان ہے جب اس پر نیا خیال قوّتِ متخیّلہ کے ذریعے وارد ہوتا ہے۔ افلاطون نے شاعری کو دیگر عوامل سے منفرد قرار دے کر دیوانگی قرار دیا تھا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ شاعر کی ذہنی حالت عام انسان سے مختلف ہوتی ہے۔ نفسیات کا تعلق انسانی شعور، تحت الشعور اور لاشعور کے گہرے مطالعے پر منحصر ہے۔ شہزاد نیّر نے اپنی تمام شعوری خصوصیات کو بروئے کار لا کر انسانی نفسیات کو بہت اعلیٰ اور منفرد انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

اشعار دیکھیے:

؎ جگ مگ
راہِ ادراک سے آگے
وہاں۔۔ اُس ملگجی گھر میں
جہاں رستہ اندھیرے میں پھسلتا ہے (۱۹)

مذکورہ مصرعوں میں شہزاد نیّر نے اس بات کی وضاحت کی ہے جب انسانی لاشعور میں کوئی خیال آتا ہے تو وہ خیال اس قدر مبہم ہوتا ہے کہ اس کی صحیح پہچان نہیں ہو پاتی۔ تخلیق کار اس خیال کو محفوظ کرنے کی کوشش میں اپنے شعوری عمل سے کام لیتا ہے مگر اس کی رسائی اُس خیال تک نہیں ہو پاتی۔ شہزاد نیّر لکھتے ہیں:

؎ لپکتا ہوں
ابھی تھا۔۔۔ اِس جگہ
لیکن نہیں

خود کو چرا کر بھاگ جاتا ہے

اسی تاریک جنگل میں

جہاں میری رسائی ہو نہیں سکتی (۲۰)

خیال کا آنا اور پھر چلے جانا فطری اور تخلیقی عمل کا حصہ ہے۔ ایسا خیال لاشعور میں گھر کر لیتا ہے اور پھر قبو نہیں آتا۔ ایک اور نظم سے اشعار دیکھیے :

عقل مینار پر

دوربیں آگہی سے

اندھیروں کی وسعت میں بکھرے ہوئے

کائناتی منظر کو دیکھا

تو میں اور چھوٹا ہوا

اس قدر میری تصغیر ہوتی گئی (۲۱)

یہ انسانی فطرت ہے کہ کم علم رکھنے والا انسان یا دنیا سے نا آشنا انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ وہ بہت بڑی حیثیت کا مالک ہے لیکن جیسے جیسے انسان شعوری گہرائی سے کام لیتا ہے اور کائنات کو مسخر کرنے لگتا ہے، اسے اپنا آپ بے مایہ اور کم قیمت لگنے لگتا ہے۔

رومانی انداز:

شہزاد نیّر کے کلام میں رومانی عنصر بھی غالب نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت کی کرشمہ سازیاں واضح دکھائی دیتی ہیں۔ اس معاملے میں شہزاد نیّر قدیم روایت کے پیروکار نظر آتے ہیں۔ شہزاد نیّر عشق و

محبت کو رکھ رکھاؤ کے تابع کر کے اپنی بات کو ایسے علامتی انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری ان کی بیان کردہ پریم کہانی کو ہوس سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ شہزاد نیّر کائنات کو محبوبیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مظاہرِ فطرت کو محبت کے رنگ سے رنگ کر پینٹ کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال دیکھیے :

یہ مانا کچھ نہیں باقی
نگاہوں میں دل آرائی
نہ باتوں میں جبیں سائی
جو سانسیں باندھ رکھتی تھیں!
جنونِ آبلہ پائی
یہ کیسا موڑ ہے
اُن منزلوں کا عکس بھی
اَب پتلیوں پر پھیل جاتا
جنھیں ہم زندگی سمجھے
مگر ٹھہرو، وہیں سے بات کرتے ہیں (۲۲)

اس نظم میں گزری محبت کا ذکر ملتا ہے اور عاشق اپنے محبوب سے مخاطب ہے۔ شہزاد نیّر رومانیت میں بھی حقیقت پسندی کے قائل ہیں۔ وہ اپنی محبت کو بھی حقیقت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ محبت کو ضرورتوں کا محتاج نہیں ہونا چاہیے۔ نظم کا انداز خطابانہ ہے۔ عاشق ماضی کے حسین دنوں کو یاد کرتا ہے۔ اس نظم کا مصرع ''مگر ٹھہرو، وہیں سے بات کرتے ہیں'' خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس میں شاعر اپنے بیتے لمحات کو یاد کرنا اور دوہرانا چاہتا ہے۔ ایک اور مثال دیکھیے :

ے ضرورت تھی

تمھیں اپنی مجھے اپنی

ضرورت بھی کئی رنگوں میں آتی ہے

کسی کو چاہنے میں لوگ

اپنے آپ سے دھوکا نبھاتے ہیں

سواب کچھ بھی نہیں باقی

مری مانو، اسی کو مان کر چلتی چلو

دیکھو، حقیقت مان لینے سے خسارہ کچھ نہیں ہوتا! (۲۳)

آخری مصرعے میں حقیقت مان لینے سے مراد یہ ہے کہ دونوں کی محبت ضرورتوں کی محتاج ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ بجائے ضرورتوں کو پورا کرنے کے ہم یوں کرتے ہیں کہ علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں اور اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ یوں ہم ایک دسرے کو دھوکہ دینے سے بھی بچ جائیں گے۔ یوں محبت کا بھرم قائم رہے گا۔ ایسی کئی مثالیں شہزاد نیّر کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہیں۔

زبان و بیان کی خوبی:

شعر یا کلام میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے صرف خیال اور حسن پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ زبان و بیان کو بھی برتا جاتا ہے۔ زبان کی تازگی اور اسلوب کی نفاست سے ہی کلام انفرادی مقام حاصل کر کے قاری کے لاشعور میں جگہ حاصل کرتا ہے اور اس کے وہم و گمان میں بس جاتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو شہزاد نیّر اس معاملے میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ شہزاد نیّر سماجی اور تہذیبی شعور کے ساتھ بدلتی ہوئی قدروں کو ہم آہنگ کر کے تخلیقی انداز اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نظموں کو پڑھ کر قاری ان کے جذبے اور فکر کے ساتھ ساتھ عمیق مشاہدے کی گرفت میں آجاتا ہے۔ شہزاد نیّر نے زبان و بیان کے حوالے سے نئے تجربے بھی کیے ہیں۔ انھوں نے کئی نئی تراکیب وضع کی ہیں۔ ان کی وضع کردہ تراکیب اور محاورات میں ''خون کا پتھر ہونا''، ''برف کا کالی رِدا میں

مستور ہونا''، ''دیو مالائی چپ''، ''چشمِ فطرت''، ''خانہ برف'' وغیرہ شامل ہیں۔ بنت کاری اور زبان دانی کی مثال دیکھیے:

عقل مینار پر
دوربیں آگہی سے
اندھیروں کی وسعت میں بکھرے ہوئے
کائناتی مظاہر کو دیکھا
تو میں اور چھوٹا ہوا
جتنا آگے بڑھا
اس قدر میری تصغیر ہوتی گئی
اب میں پوروں میں ہوں (۲۴)

فکر اور خیال میں جدت پسندی کے ساتھ ساتھ شہزاد نیّر زبان و بیان میں بھی جدت برتتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے کالم میں پرانے اور فرسودہ مضامین کے ساتھ ساتھ پرانی تراکیب اور گھسے پٹے محاوروں سے بھی اجتناب کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ موجودہ عہد کی شاعری کو نئی زبان سے آشنا کرنے کے قائل ہیں اور اسی سبب نت نئے تجربے ان کے کلام میں وارد ہوتے ہیں۔

شہزاد نیّر عربی اور فارسی زبان پر بھی دست رس رکھتے ہیں۔ ان کا ذخیرہ الفاظ وسیع ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے الفاظ ان کے آگے دست بستہ کھڑے ہیں اور وہ موقع محل کی مناسبت سے الفاظ برتتے چلے جاتے ہیں۔ شہزاد نیّر دقیق الفاظ استعمال کرنے کے قائل نہیں۔ وہ سادہ الفاظ میں پورا مفہوم سمجھا دینے پر قادر ہیں۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

؎ کب تلک برف بن کر جمی ہی رہوں

کیوں نہ پانی بنوں اور روانی بنوں

میرے سورج! میرے دیوتا!

کچھ حرارت ملے

نقطۂ منجمد سے میں اوپر اٹھوں (۲۵)

شہزاد نیّر گو کہ کلاسیکیت پسند نہیں مگر وہ اپنی شاعری میں زبان کا استعمال کئی نزاکتوں کو مدّ نظر رکھ کر کرتے ہیں۔ شہزاد نیّر کی بنت کاری کے تجربے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جدا جدا اور مکمل مصرعوں کے ملاپ سے تدریجی مراحل طے کرنے والی آزاد نظم کی بجائے ایک دوسرے میں جذب ہوتے مصرعوں کے تسلسل سے تشکیل پاتی نظم کے قائل ہیں۔

استعارات وتشبیہات:

شاعری کی فنّی دنیا میں تشبیہات واستعارات بہت اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ اگر علمِ بیان کی دنیا سے مذکورہ چیزوں کو نکال دیا جائے تو پھر علمِ بیان کی دنیا ہمیں کھوکھلی نظر آئے گی۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال کر کے شاعر اور نثر نگار اپنے کلام یا ادبی پیرائے میں حسن یا رعنائی پیدا کرتے ہیں اور یہ حسن قاری کو بہت متاثر کرتا ہے کہ وہ کلام کو بار ہا پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔ شہزاد نیّر کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جو تشبیہات و استعارات میں جدیدیت اور انفرادیت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں اور روایتی طور سے پرانی تشبیہات کو ترک کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تشبیہ کا انوکھا انداز دیکھیے:

؎ عدو کے تنگ سینے کی طرح یہ تنگ رستے ہیں

شبوں کے بے کرم لمحوں میں ان راہوں پہ چلتا ہوں

کہ جن پر برف کی چادر

رگوں کو سرد کرتی ہے (۲۶)

ایک اور مثال دیکھیے :

؎ عدو کی بے حسی ایسی

کہ اس اندھی بلندی پر

نہ جانے کتنے سالوں سے

فقط بارود کی صورت ہمارا رزق آتا ہے (۲۷)

شہزاد نیّر کے استعارات وتشبیہات کے استعمال کے مزید رنگ دیکھیے :

؎ بارہا ایسی کوئی گم نام سی پُرسوز لے

درد کی صورت

میرے سینے میں جم کر رہ گئی (۲۸)

دوسری مثال دیکھیے :

؎ بال چڑیا کا اجڑا ہوا گھونسلا

زرد ماتھوں پہ مکڑی نے جالے بنے

خشک مکڑی کے مانند ابرو تنے

آنکھیں ویران۔۔۔خالی مکاں کے دریچے ہیں سہمے ہوئے (۲۹)

مندرجہ بالا پہلی مثال میں شہزاد نیّر نے تشبیہ کو قدرت کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے گم نام کہہ کر درد قرار دیا ہے اور اپنے سینے میں جم جانے کی بات کی ہے۔ دوسری مثال میں بالوں کو چڑیا کا اجڑا ہوا گھونسلا اور ابروؤں کو خشک لکڑی قرار دیا ہے اور آنکھوں کو خالی مکان کے دریچوں جیسا بیان کی ہے۔

علامت نگاری:

علامت نگاری کی بات کی جائے تو شعرا نے ہر دور میں علامت سے کام لیا ہے اور علامتی زبان کا استعمال کرتے ہوئے اپنے کلام کی بنیادی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ جدید شعرا نے نظم میں بھی علامت کو جدت کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے اپنی بات دل نشیں پیرائے میں بیان کی ہے۔ اگر علامتی نقطہ نظر سے شہزاد نیّر کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے ہاں علامتوں کا دریا بہتا دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے جدید اور منفرد علامتوں کا استعمال کرتے ہوئے انھیں اپنی نظموں کے گروہ میں شامل کیا ہے۔ اپنی وضع کردہ علامتوں اور علامتی انداز کو اپناتے ہوئے کلام میں خوبی سے انھیں برتتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شہزاد نیّر کے کلام میں ''برف'' کی علامت بہت زیادہ استعمال ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے برف کو علامتی انداز میں پیش کرتے ہوئے زندگی کی حرارتوں اور احساس کی رنگینیوں کی خوب وضاحت کی ہے۔

مثال دیکھیے:

جہاں میں ہوں

وہاں برف اندر برف اُگتی ہے

جہاں اتنی بلندی ہے کہ سانسیں ڈگمگا اٹھیں

ہوائیں بے حیات اتنی کہ موسم تھرتھرا اٹھیں

جہاں پر زندگی کرنے کے امکاں ٹوٹ جاتے ہیں (۳۰)

نظم ''آتش'' میں شہزاد نیّر برف کو کچھ انداز میں بیان کرتے ہیں:

لیکن ہمارا سبز آئندہ جلاتی

آسمانی بادشاہت برف ہے (۳۱)

ایک اور نمونہ دیکھیے:

خدائے بے نیازِ موسم و آب و ہوائے دل

ہمارے دکھ تجھے محسوس کیسے ہوں

اگر چھت آسماں ہو

اور بدن پر برف پڑ جائے

تو کیسے رات کٹتی ہے

خداوند! تجھے سردی نہیں لگتی (۳۲)

منظر کشی:

شہزاد نیّر اپنی نظموں میں مناظر تصویر کشی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں واقعے کو واضح اور جان دار بنانے کے حوالے سے اعلیٰ مناظر دکھائے جاتے ہیں جو قاری پر اچھا تاثر چھوڑتے ہیں۔ منظر کشی کے

نمونے دیکھیے :

میں بدن کے تنومند گھوڑے پہ بیٹھے ہوئے
جھلملاتی انا کی چمکتی ہوئی تیز تلوا
پہچان کے تیز رنگوں کی دستار باندھے ہوئے
میرے اجداد کا امتیازی نشان
اپنے ہونے کے نشے میں ڈوبا ہوا (۳۳)

شہزاد نیّر نے بگ بینگ تھیوری کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔شہزاد نیّر بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ وقت، بگ بینگ کے ساتھ ہی وجود میں آیا۔مثال دیکھیے :

وقت بہتا رہا
میں وہیں تھا
مجھے اَدھ کٹے جسم گننے کی تفویض تھی (۳۴)

مندرجہ بالا نظم میں نابودیت کا موضوع ملتا ہے۔نابودیت یعنی Non-existence۔یہ ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے جس میں اشیا نا موجود اے موجود میں آتی ہیں یا پھر اپنا وجود کھو دیتی ہیں۔یہ موت کے بعد مکمل فنا پذیری کا نظریہ ہے۔جس کے مطابق انسان مکمل طور پر فنا ہو جائے گا۔یعنی انسان کا جسم اور روح مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے۔اصل میں یہ اخلاقی اور علم الکلامی شکوک وشبہات کا فلسفہ ہے۔اس کے بارے میں بہت سی آرا ہیں۔عیسائیوں کے ہاں یہ نظریہ ہے کہ موت کے بعد نیک روحیں بہتر جگہ پر ہوتی ہیں اور ظالم لوگ بدتر جگہ پر

اپنے اپنے فیصلے کا انتظار کرتے ہیں۔اسی طرح اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ نیک لوگوں کو قبر میں سکون ملتا ہے اور بدی کرنے والے کا عذاب قبر میں پڑتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

نابودیت:

نظم ''نوحہ گر'' میں شاعر نے نابودیت کی اصطلاح تخلیقِ کائنات اور تصورِ موت کے حوالے سے کی ہے۔جیسے کہ نیستی سے ہستی کا وجود میں آنا اور سائنسی حوالے سے دیکھیں تو ایٹم بم سے ہستی کا نیستی میں بدل جانا۔

مثال ملاحظہ ہو:

سے نہ ہونے کی بے جسم آغوش میں
بے زمانی کے پہلو بچھے خالی پن میں
جہاں بے جہت لامکاں پر
کوئی لاش راج کرتی تھی
کچھ بھی نہ تھا۔
روشنی، تیرگی، سمت، آواز۔۔۔سب نیستی!
بے وجودی کے معدوم سے
''کچھ نہیں'' کی عدم دوش چوٹی سے
بس ایک لمحے کا پھسلاؤ
سمت آشنا غیر مادے سے ٹکراؤ
نقطے کا پھیلاؤ ہونے میں بدلا (۳۵)

نوحہ گر کا کردار:

نظم میں شاعر نے نوحہ گر کردار اجتماعی انسانی ضمیر کے لیے مختص کیا ہے۔ یہ ایک ایسی صدا ہے جو ضمیر کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے اور سنائی دیتی ہے۔ اس کردار کے ذریعے شاعر نے انسانی تاریخ کی بھیانک تصویر کشی کی ہے۔ شاعر کہتا ہے:

؎ کسی ہاتھ میں نوحہ گر کا قلم ہلا
خون، آدم کی تاریخ لکھتا رہا
ہر ورق پہ لہو جھلملاتا رہا (۳۶)

ان تین مصرعوں میں انسانیت سوز سلوک کی داستان رقم کی گئی ہے۔ یہ شاعر کے مطالعاتی اور مشاہداتی ہنر کا نادر نمونہ ہے۔ نوحہ گر کردار بیک وقت قدیمی بھی ہے اور نوحہ گر بھی ہے۔ ایک برابر تجزیہ کرتا ہے اور دوسرا ماتم۔ یہ ایک علامتی کردار ہے جو قتل و غارت کو پسند نہیں کرتا اور قتل و غارت پر اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی نظم میں رجائیت کا پہلو نمایاں ہے۔ ماضی کے تلخ واقعات کا بیان کر کے شاعر آئندہ کے لیے پُر امید ہے۔ اسے ایک روشن مستقبل دکھائی دیتا ہے جو امن و سلامتی کا گہوارہ ہوگا۔ جہاں انسانیت سوز سلوک نہ ہوگا۔ انسان کی قدر ہوگی، عزت ہوگی اور بہتر وسائل میسر ہوں گے۔

شہزاد نیّر کے مجموعی فکری و فنّی رویوں کا جائزہ لیا جائے تو وہ ہمیں تعقل پسندی اور حسن کاری کے شوق میں مشغوک دکھائی دیتے ہیں۔ وہ درون اور بیرون ذات رونما ہونے والے کسی بھی واقعے کو فکر کی کسوٹی پر پرکھے بغیر سپرد قلم نہیں کرتا۔ ان کے اندر کا بیٹھا ہوا تجزیہ کار ہر واقعے کا تجزیہ کرتا ہے۔

تمثال نگاری:

شہزاد نیّر اپنے کلام میں تمثیلی انداز اپناتے ہیں۔ ان کی تمثالیں واحدانی ہیں۔ یعنی وہ خیال کی کسی ایک پرت کو تمثال در تمثال کی بجائے ایک امیج کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ مصرع سازی میں بھی وہ یہی رویہ اپناتے

ہیں۔ دوسری خصوصیت ان کی تمثالوں کا متحرک ہونا ہے۔ ساکن تمثالیں ان کے ہاں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔

موضوعات:

شہزاد نیّر کے کلام میں انسان کو درپیش آلام، مسائل اور محرومیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ انسان دوست شاعر ہیں۔ کائنات کا دریافتی پھیلاؤ اور لمحہ بہ لمحہ بدلتے عالمی حالات انھیں متاثر کرتے ہیں۔ انھی سب کو انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

حوالہ جات

۱۔شہزاد نیّر۔ برفاب۔ لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء۔ص۲

۲۔ایضاً۔ص۳

۳۔ایضاً۔ص۴

۴۔ایضاً۔ص۱۶

۵۔ایضاً۔ص۱۵

۶۔ایضاً۔ص۹

۷۔ایضاً۔ص۱۸

۸۔ایضاً

۹۔ایضاً۔ص۱۲

۱۰۔ایضاً

۱۱۔ایضاً۔ص۶۴

۱۲۔ایضاً۔ص۲

۱۳۔ایضاً۔ص۴

۱۴۔ایضاً

۱۵۔ایضاً

۱۶۔ایضاً

۱۷۔راقمہ کا شہزاد نیّر سے ٹیلی فونک انٹرویو، ۲۶۔ستمبر، ۲۰۲۱ء۔وقت: ۴ بجے

۱۸۔شہزاد نیّر۔ برفاب۔ص۸۸

۱۹۔ایضاً

۲۰۔ایضاً

۲۱۔ایضاً۔ص۳۶

۲۲۔ایضاً

۲۳۔ایضاً

۲۴۔ایضاً ص ۶۷

۲۵۔ایضاً

۲۶۔ایضاً

۲۷۔ایضاً۔ص ۸۷

۲۸۔ایضاً۔ص۱۰۲

۲۹۔ایضاً

۳۰۔ایضاً

۳۱۔ایضاً۔ص۲۳۰

۳۲۔ایضاً

۳۳۔ایضاً

۳۴۔ایضاً۔ص ۳۷

۳۵۔ایضاً

۳۶۔ایضاً

محاکمہ

ایک ادیب کسی بھی معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس ہونے والے واقعات سے لازمی اثر لیتا ہے اور کسی طور انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جبھی صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے اور یہ تحریریں ہی انسان کی شخصیت کی آئنہ دار ہوتی ہے۔ ان تحریروں سے بھی ہم شخصیتوں کو جانچ لیتے ہیں۔ یہ ادبی سرمایہ، لکھنے والے کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے

شہزادنیّر کے آباؤ اجداد عرصہ دراز سے گوجرانوالہ کے نواحی گاؤں گوندلانوالہ میں پیدا ہوئے۔ وہ کھیتوں میں کام کر کے روزی کماتے۔ شہزادنیّر کے والد کا نام محمد رفیق تھا۔ وہ ایک صنعتی مزدور تھے۔ والدہ کا نام صغریٰ بی بی تھا۔ شہزادنیّر کا اصل نام محمد شہزاد ہے۔ ان کی پیدائش ۴۔ اپریل ،۱۹۷۳ء کو اپنے گاؤں میں ہوئی۔ شہزادنیّر کے چھے بہن بھائی تھے۔ گھر میں شروع سے ہی غربت کا دور دورہ تھا۔ تمام بہن بھائیوں نے بڑی حسرت میں بچپن گزارا۔ شہزادنیّر کو بچپن سے ہی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ تعلیم سے انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ اس کے لیے انھیں بے حد کوشش اور لگن سے جستجو کی اور اپنی قابلیت کی بنا فوج میں میجر کا درجہ حاصل کیا۔ انھوں نے تمام عمر وطن کی خاطر کام کیا اور اپنی نظموں میں بھی بارہا اس کا ذکر کیا ہے۔

مقالے کا عنوان ''شہزادنیّر کی نظموں ''خاک'' اور ''نوحہ گر'' کا فکری و اسلوبیاتی جائزہ'' ہے۔ مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تقسیم یہ ہے:

باب اوّل: شہزادنیّر۔ سوانح و شخصیت

اس باب کو بھی تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

(الف) سوانح:

اس حصے میں شہزادنیّر کے سوانحی حالات مذکور ہیں۔

(ب) تصانیف:

اس حصے میں شہزادنیّر کی تصانیف کا بیان کیا گیا ہے۔

(ج) شخصیت:

اس حصے میں شہزاد نیّر کی شخصیت کو بیان کیا گیا۔ یہ بیان ان کے احباب، بیوی اور اولاد کے حوالے سے ہے اور کچھ باتیں خود شہزاد نیّر کی بتائی ہوئی ہیں۔

باب دوُم: شہزاد نیّر کی نظم ''خاک'' کا فکری و اسلوبیاتی جائزہ

اس باب میں شہزاد نیّر کی نظم ''خاک'' کو پرکھا گیا ہے جو ان کی تصنیف ''برفاب'' سے ماخوذ ہے۔

باب سِوُم: شہزاد نیّر کی نظم ''نوحہ گر'' فکری و اسلوبیاتی جائزہ

اس باب میں شہزاد نیّر کی طویل نظم ''نوحہ گر'' کا فکری و اسلوبیاتی جائزہ لیا گیا ہے جو ان کی تصنیف ''گرہ کھلنے تک'' سے ماخوذ ہے۔

باب چہارم: شہزاد نیّر کی شاعری پر ایک نظر

اس باب میں شہزاد نیّر کی شعری کتب کے حوالے سے فکری وفنّی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

شہزاد نیّر کے تمام کلام میں شعری محاسن اپنی پوری آب و تاب سے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے زمینی حقائق کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور اپنے کلام میں تاریخی اور تہذیبی شعور کو بھی برتا ہے۔

کتابیات

انور سدید، ڈاکٹر۔ اردو ادب کی تحریکیں۔ کراچی: انجم ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۷ء

خالد اقبال یاسر۔ جدید تحریکات اور اقبال۔ لاہور: حاجی حنیف پریس، ۲۰۱۵ء

رشید امجد، ڈاکٹر۔ پاکستان کی نئی نظم پر گفتگو۔ راولپنڈی: ایس ٹی پرنٹرز، ۱۹۸۱ء

سجاد باقر رضوی۔ مغرب کے تنقیدی اصول۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۳ء

شہزاد نیّر۔ برفاب۔ لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

شہزاد نیّر۔ گرہ کھلنے تک۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

محمود علی سڈنی۔ فلسفہ، سائنس اور کائنات۔ لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۵ء

یوسف حسن۔ اردو نظم کے پچاس سال۔ لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، ۲۰۱۵ء

رسائل:

ادبِ لطیف۔ لاہور، شمارہ نمبر ۷، جولائی، ۲۰۱۵ء

اوراق۔ لاہور، جلد نمبر ۱۹، شمارہ نمبر ۳، ۴، ۱۹۸۴ء

انٹرویوز:

راقمہ کا شہزاد نیّر سے ٹیلی فونک انٹرویو، ۶۔ ستمبر، ۲۰۲۱ء۔ وقت: ۴ بجے

راقمہ کا شہزاد نیّر سے ٹیلی فونک انٹرویو، ۱۷۔ ستمبر، ۲۰۲۱ء۔ وقت: ۸ بجے

راقمہ کا شہزاد نیّر سے ٹیلی فونک انٹرویو، ۲۶۔ ستمبر، ۲۰۲۱ء۔ وقت: ۴ بجے

راقمہ کا شہزاد نیّر سے ٹیلی فونک انٹرویو، ۲۵۔ اکتوبر، ۲۰۲۱ء۔ وقت: ۴ بج کر چھبیس منٹ